نسیم بہار
اے۔سی۔بہار

نسیمِ بہار

تین سو پچاس رُباعیات کا مجموعہ

امیر چند بہار

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ نئی دہلی

سنِ اشاعت	نومبر ۱۹۷۱ء
تعداد	پانچ سو
کتابت	آرٹ کارنر ۵۶۴ ٹیامحل دہلی
طباعت	یونین پرنٹنگ پریس دہلی
قیمت	سات روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ نئی دہلی

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اُردو بازار
دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

انتساب

ڈاکٹر ملک راج آنند کے نام

جن کی

بے باکانہ تحریروں نے مجھے بہت

متاثر کیا

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم
چو غلامِ آفتابم، ہمہ آفتاب گویم
(رومی)

اِس انجمنِ گُل میں

مکتوبِ گرامی

(از پدم شری علی سردار جعفری)

۱۰۔ سیتا محل
بومان جی پٹیل روڈ۔ بمبئی
۱۵ راگست ۱۹۷۰ء

برادرم بہار صاحب

تسلیم۔ میں نے اگست ۱۹۶۹ء میں آپ کی رُباعیات پڑھ کر دیباچہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ وعدہ اپنی علالت کی وجہ سے اب تک پُورا نہ کر سکا۔ یہ ایک قرض ہے جو مجھے ادا کرنا ہے۔ آپ کی رُباعیات میرے دیباچے کی محتاج نہیں ہیں، لیکن حُسن اور صداقت کی شہادت دینا میرا فرض ہے۔ اپنے دیباچے کے ذریعے سے اس حسن اور صداقت کی شہادت دینا چاہتا تھا۔ اب بہتر یہ ہوگا کہ آپ کتاب شائع کر دیجئے اور مجھے موقع دیجئے کہ میں تبصرے کے ایک مضمون کی شکل میں اپنا قرض ادا کر سکوں۔

مُمکن ہو تو میرا یہ خط کتاب میں شامل کر لیجئے تاکہ اُس کوتاہ قلمی کا اعتراف بہتر طریقے سے ہو سکے جس کا ارتکاب علالت کی وجہ سے ہُوا ہے۔

آپ کا
سردار جعفری

تقریظ

(از جناب عرشؔ ملسیانی)

رُباعی بڑی مشکل صنفِ سخن ہے۔ شاعر جب مشق کی منزلیں طے کر چکتا ہے تو غزل اور دیگر اصنافِ سخن کے بعد رُباعی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہمارے نوجوان دوست امیر چند صاحب جن کا تخلص بہارؔ ہے اور وہ خُود ایک باغ و بہار انسان ہیں حال ہی میں انگریزی کی مستند نظموں کا ترجمہ اُردو نظم کی صُورت میں شائع کر چکے ہیں۔ اربابِ نظر نے انھیں بہت داد دی ہے۔ اب انھوں نے مختلف موضوعات پر رُباعیاں لکھی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اُن کی رُباعیاں دراصل رُباعیاں ہیں، قطعات نہیں۔ آجکل فنِ شعر سے نابلد شُعرا کو رباعی اور قطعہ کا فرق بھی معلوم نہیں۔

اُن کی رباعیوں کے موضوعات فرسودہ نہیں، بلکہ زندہ و پائندہ ہیں۔ علم و اخلاق، دَورِ حاضر، سائنس اور امنِ عالم، فکر و فن، مشاہدات و تجربات، یادیں، مناظرِ قدرت، حُسن و عشق، قومیات اور طنز و مزاح کے عنوانات سے انھوں نے دل آویز رباعیاں کہی ہیں۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ تفصیلاً اُن کی رباعیوں کے محاسن بیان کروں۔ جو خُود بہار ہیں اُن کے گلستان کو خود قیاس کر لیجئے، گُلہائے رنگا رنگ سے مزین ضرور ہو گا۔

نوجوانی میں پختہ کاری اور اس کے ساتھ انگریزی ادب سے اُن کی وابستگی اُنھیں سُوقیانہ راہوں کی طرف جانے سے روکتی ہے۔ اِس لئے رُباعیوں میں فکر و نظر کے ساتھ ساتھ

پاکیزگیٔ خیال و بیان بھی ہے۔

خیّام نے طنز کے تیر چلائے۔ سماج کی خرابیوں کو آشکار کیا۔ خُدا سے بھی لے دے کی۔ بہار کی صرف ایک رُباعی درج کرتا ہوں، جو ہمارے سماج اور معاشرے پر بھرپور طنز ہے ؎

اس دہر کے پُرپیچ بہت رستے ہیں
یارانِ ریاکار یہاں بستے ہیں
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے بشر
سانپوں کی طرح لوگ یہاں ڈستے ہیں

مجھے اُمید ہے اس خوش فکر اور بیدار مغز نوجوان کی یہ رُباعیاں مُلک میں مقبول ہوں گی اور داد و دہش کی حق دار ٹھہرائی جائیں گی۔

عرش ملسیانی

۱۱/۴۴ ایف ماڈل ٹاؤن
دہلی ۹

پیش لفظ

(از ڈاکٹر سلام سندیلوی، ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی، ڈی لٹ)

دَور حاضر اضطراب و انتشار کے طوفان میں تنکے کی طرح بہا چلا جارہا ہے۔ اس عہد کی نمایاں خصوصیت بے ربطی، بدنظمی اور بے اصولی ہے۔ اس دَور میں نرگسیت کی مسخ شدہ شکلیں انسانی ذہن کے نشیب سے اُبھرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مثلاً ظلم پسندی ..... (Sadic tendency) اِس دَور کی ایک عام خصوصیت ہے۔ جنگ وجدل میں خوں ریزی عہدِ قدیم سے جائز رہی ہے جو اس دور میں بھی قائم ہے مگر اس دَور میں جب انسان دُوسرے پر ظلم کرتا ہے تو لذّت یاب بھی ہوتا ہے۔ آج امریکہ ڈُنیا کا سب سے ترقی یافتہ مُلک ہے جہاں فی گھنٹہ ایک قتل ہوتا ہے۔ تقریباً یہی حال دُوسرے ملکوں کا بھی ہے۔

یہی نہیں بلکہ آج کا انسان دُوسرے سے اپنے جسم کو اذیت پہنچانے میں بھی لُطف حاصل کرتا ہے۔ اس کو علمِ نفسیات میں (Masochistic tendency) کہتے ہیں۔ مثلاً اٹلی کے بعض کلبوں میں کوئی حسینہ کسی عاشق کے جسم پر کوڑے رسید کرتی ہے اور فی کوڑا کافی رقم وصول کرتی ہے۔ اس حسینہ کو مارنے میں اتنا لطف نہیں آتا جتنا لُطف عاشق کو مار کھانے میں آتا ہے۔

دورِ حاضر کی ایک اَور خصوصیت ہے آج کا انسان بہت زیادہ عریانیت پسندی

میں گرفتار ہوگیا ہے (Exhibitionist tendency) ثبوت کے طور پر ہپیّوں (Hippies) کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ ہپیوں کی زیادہ تعداد تو امریکہ ہی میں پائی جاتی ہے مگر وہ انگلینڈ، اسٹریلیا، جاپان، ہالینڈ، فرانس اور جرمنی میں بھی موجود ہیں۔ غرضیکہ آج کے انسان کی دماغی چولیں کافی ڈھیلی ہوچکی ہیں اور اس کے سوچنے سمجھنے کا طریقہ نہایت خام، ناقص اور مبہم ہے۔ اسی قسم کا انتشار ہمارے موجودہ ادب میں بھی داخل ہوگیا ہے۔ نئی غزل، نئی نظم اور نیا افسانہ اس انتشار کی جولانگاہ ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہماری سنجیدہ صنف سخن رُباعی نے ان انتشار پسندوں کو منھ نہیں لگایا ہے اور وہ ابھی تک اپنے مہذب اور متین لباس میں جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے شعرا بھی جب رُباعی کہتے ہیں تو بحر ہزج کے اخرب و اخرم اوزان ہی میں کہتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ قدیم عہد میں بابا طاہر عریاں ہمدانی نے رُباعی بحر ہزج کے اخرب و اخرم اوزان کے بجائے بحر ہزج مسدس محذوف میں کہی ہے مگر ایران کے محققین نے اس کی رُباعیات کو بہ حیثیت رباعی کے تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ اس کو دوبیتی کے نام سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ نے بھی بابا طاہر کی تقلید میں کچھ رُباعیاں کہی ہیں جو "پیامِ مشرق" میں شامل ہیں۔ مگر ان کو اصل رُباعیاں کہنا درست نہیں ہے۔ اسی طرح جگن ناتھ آزادؔ نے اقبالؔ کی تقلید میں کچھ رباعیاں کہی ہیں۔ مگر ان کو ہم رُباعی کے دائرے میں نہیں رکھ سکتے ہیں۔

یہ خوشی کی بات ہے کہ جب سے رُباعی کی ایجاد ہوئی ہے اُس وقت سے اب تک زیادہ تر شعراء نے رُباعی کو بحر ہزج کے اخرب و اخرم اوزان ہی میں کہا ہے۔ رُباعی کے مجموعے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں اور ان میں رُباعیاں مقررہ اوزان ہی میں

نظر آتی ہیں۔ چنانچہ میرے مخلص دوست جناب بہار صاحب نے بھی اپنی رُباعیاں بحرِ ہزج کے اخرب و اخرم اوزان ہی میں کہی ہیں۔

اِس سلسلے میں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے۔ فارسی میں رباعی عشق، تصوّف، معرفت، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کے لئے مخصوص ہوگئی تھی۔ مثلاً عمر خیام، عطار، رومؔ، سعدیؔ، عرفیؔ، حافظ، جامیؔ اور سحابی استر آبادی نے انھیں موضوعات پر رُباعیاں کہی ہیں۔ جب رباعی کو اُردو شعرا نے اپنایا اُس وقت بھی یہ صنف انہی موضوعات سے وابستہ رہی۔ چنانچہ ولیؔ، سراجؔ اورنگ آبادی، دردؔ، سوداؔ، میرؔ، قائمؔ چاند پوری، غمگینؔ دہلوی، انشاؔ، جرأتؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، امیرؔ مینائی اور داغؔ وغیرہ نے انھیں موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے باوجود چند شعرا ایسے بھی ہیں جنھوں نے رُباعی کے موضوعات میں کچھ جدّت کی ہے۔

جب دَورِ جدید نے اُردو ادب کی سرحد میں قدم رکھا تو اس میں ایک نئی آب و تاب پیدا ہوگئی اور رُباعی کے موضوعات میں کچھ اور اضافہ ہوگیا۔ چنانچہ مولانا حالیؔ نے اخلاقی رباعیاں کہیں۔ اکبرؔ نے طنزیہ رباعیاں پیش کیں۔ امجدؔ حیدر آبادی نے متصوفانہ رباعیات کی تخلیق کی۔ جوشؔ سیاسی رباعیات منظرِ عام پر لائے۔ فراقؔ نے سنگار رس کی رُباعیات کو اُردو کے میخانے میں سجایا۔ ساغرؔ نظامی نے نرگسی رباعیات کے جام چھلکائے۔ اس کے علاوہ جمیلؔ مظہری نے اپنی رُباعیات میں مختلف مفکّرین کے نظریات سے بحث کی ہے۔ بہار صاحب[1]

---

[1] مَیں نے بھی ایک سو رباعیاں نئے طرز کی کہی ہیں جو میری رباعیات کے مجموعے "شام و شفق" میں موجود ہیں۔ یہ تلمیحاتی رُباعیات ہیں جن میں منظر کی تشبیہ کسی تاریخی یا روایتی واقعے سے دی گئی ہے۔

نے بھی کچھ نئے موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی رباعیات کا ایک عنوان "سائنس اور امنِ عالم" رکھا ہے۔ اس کے تحت وہ فرماتے ہیں ؎

سائنس کو مغرب میں خدا کہتے ہیں　　جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
اِن ٹینکوں سے جن کے اُڑے ہیں بازو　　اُن سے بھی تو پوچھو اسے کیا کہتے ہیں

یہ ٹینک، یہ بارود، یہ توپ اور یہ بم　　ہیں دشمنِ تہذیب، عدوئے آدم
اللہ سے تو ہے بارشِ رحمت کی طلب　　برساتے ہو خود آگ فضا میں پیہم

سائنس کو الزام عبث دیتے ہو　　شیطان کو دشنام عبث دیتے ہو
درپردہ جو ہو مائلِ تیاریِ جنگ　　پھر امن کا پیغام عبث دیتے ہو

بہار صاحب نے اپنے ماحول کا مشاہدہ اور مطالعہ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس امر کے معترف ہیں کہ سائنس نے انسانوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے اور اس کو ترقی دے کر بامِ فلک تک پہنچا دیا ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کو احساس ہے کہ سائنس نے انسان کی پامالی کے سامان بھی بہت فراہم کئے ہیں۔ وہ مسلح امن (Armed Peace) کے نکتے سے واقف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس دور میں یہ اصطلاح ایجاد ہوئی تھی وہ ایسا ہی ریاکاری اور بدکاری کا دور تھا۔ یہ دور ۱۸۷۸ء سے ۱۹۱۴ء تک قائم رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاہدہ برلن کے بعد یورپ میں سکون قائم ہو گیا تھا۔ مگر یوروپی حکومتوں کے دل میں شکوک جاگزیں تھے اور ہر ملک دوسرے ملک سے خائف تھا۔ اس لئے طاقتور ممالک درپردہ جنگ کی تیاری میں مصروف تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ ایک

ملٹری کیمپ میں منتقل ہوگیا۔

اُس دَور سے لےکر موجودہ عہد تک، دُنیا کے سارے طاقتور ممالک چُپکے چُپکے اپنی قوّت میں اضافہ کرتے رہے ہیں اور زبان پر حرفِ صلح بھی لاتے رہے ہیں۔ بہار صاحب "بغل میں چھری اور منہ میں رام رام" کی پالیسی کے خلاف ہیں چونکہ "شاعری جزویست از پیغمبری" اس لئے بہار صاحب کو بھی حق حاصل ہے کہ وہ گندم نما جو فروش سیاستدانوں کو منہ توڑ جواب دیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی رُباعیات میں ان سیاستدانوں کا بھانڈا پھوڑا ہے اور معصوم عوام کو بھی آگاہی دی ہے کہ وہ اُن کے دامِ تزویر میں گرفتار نہ ہوں۔

بہار صاحب کی ان رُباعیات میں ایک نیا موضوع ملتا ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ عہدِ حاضر میں دیگر رُباعی گو شعراء نے بھی اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن بہار صاحب کا اندازِ بیان بہت دلکش اور مؤثر ہے۔ اِس لئے ان کی رُباعیات ہمارے دل پر گہرے نقوش چھوڑنے میں کامیاب ثابت ہوئی ہیں۔

بہار صاحب نے عالمی مشاہدہ کے علاوہ خود اپنے مُلکی حالات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر محبِّ وطن اپنے وطن کی خامیوں کا بھی جائزہ لینے پر مجبور ہے۔ پھر شاعر عوام سے زیادہ حسّاس ہوتا ہے، اس لئے وہ حالات سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ بہار صاحب بھی ایک حسّاس شاعر ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی گندی سیاست پر نظر دوڑائی جس کے تعفّن سے اُن کا مزاج پراگندہ ہوگیا اور وہ اپنے اصل جذبات پر پردہ نہ ڈال سکے چنانچہ وہ ہندوستان کی کیفیت مندرجہ ذیل رُباعیات میں پیش کرتے ہیں ؎

کیوں ملک میں ادبار ہے، ناداری ہے   بیماری و بیکاری و بیزاری ہے

غیروں کی غلامی سے تو آزاد ہوئے
اپنوں کی مگر مشقِ ستم جاری ہے

اِس مُلک میں رشوت کی یہ لعنت کیوں ہے
حبُّ الوطنی مالِ تجارت کیوں ہے
اربابِ سیاست نے یہ سوچا بھی کبھی
ہر شخص کے ہونٹوں پہ شکایت کیوں ہے

ہندوستان کے بازاروں میں کس قدر بے ایمانی اور ریاکاری برتی جاتی ہے اس کا حال بھی بہار صاحب کی زبانی سُن لیجئے ؎

بازار کی ہر چیز میں آمیزش ہے
گھی، دُودھ، نمک، آٹے میں آلائش ہے
پھر اس پہ کمر توڑ گرانی توبہ
جینے کی کہاں اب کوئی گنجائش ہے!

بہار صاحب نے اس بات کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے کہ بازاری اشیاء میں ملاوٹ ہی نہیں بلکہ آلائش ہوتی ہے۔ درحقیقت یہ ہندوستان کی اخلاقی پستی کی انتہا ہے بہار صاحب نے اس اخلاقی پستی کے ذکر کے لئے رُباعی کی صِنف کو پسند کیا ہے۔ دراصل رُباعی ایک فکری صنفِ سُخن کی حیثیت سے طنز نگار کے بہت کام آتی ہے اور بہار صاحب اس صنف سے مکمّل طور پر فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

اِن نئے موضوعات کے علاوہ بہار صاحب نے قدیم موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یہ ایسے موضوعات ہیں جن کا وجود فارسی اور اُردو کے قدیم شعراء کے یہاں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ دَورِ جدید میں حالؔی اور اکبر نے بھی ان موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اور اُن کو معراجِ کمال پہ پہنچایا ہے مگر بہار صاحب نے بھی اپنی نُدرت اور جِدّت کی بِنا پر اِن موضوعات میں نئی جان ڈال دی ہے۔ مثلاً علم و اخلاق کے موضوع پر اُن کی ایک رُباعی ملاحظہ کیجئے ؎

ہم مہر ووفا، صِدق وصفا بھُول گئے نیکی کا چلن، خوفِ خدا بھُول گئے
کیا مارنے مرنے کا ہے سر میں سودا صد حیف کہ جینے کی ادا بھُول گئے

مولانا حالی اور اکبر نے اپنے دَور کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اِن بزرگوں کا دَور اخلاقی دَور تھا اس لئے انھوں نے اپنی رباعیات کے ذریعے قوم کی اصلاح کی کوشش کی اور وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے مگر بہار صاحب کا دَور وہ ہے جب قوم کے سر سے پانی اُونچا ہو چکا ہے اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان میں سرمستیٔ کردار پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ اِس لئے بہار صاحب نے طنز و تشنیع کے تیر استعمال کئے ہیں۔ کیونکہ ادیب و شاعر کا یہ آخری حربہ ہوتا ہے۔

بہار صاحب کی آواز کی گونج اُن کی مندرجہ ذیل رُباعیوں میں ملاحظہ فرمایئے ؎

آزادیٔ افکار جو کھو دیتی ہے بے باکیٔ کردار جو کھو دیتی ہے
دھنس جاتی ہے ذلّت کے گڑھے میں وہ قوم سرمایۂ اقدار جو کھو دیتی ہے

بے سُود ترقی ہے، یہ کلچر بے کار یہ بیش بہا علم کا زیور بے کار
وُسعت سے دل و نظر اگر ہیں محرُوم تہذیب و تمدّن ہیں سراسر بے کار

اِس دَور میں کردار کا فقدان ہے کیوں اخلاق سے بیگانہ ہر انسان ہے کیوں
ہر چند رہا ہے ارتقا پر مائل عادات و خصائل میں حیوان ہے کیوں

عادات سے حیوان نظر آتے ہیں اطوار سے شیطان نظر آتے ہیں

کوئی جنھیں انسان نہیں کہہ سکتا   ایسے بھی کچھ انسان نظر آتے ہیں

ہر انسان مختلف جذبات کا پیکر ہوتا ہے۔ وہ کبھی مُصلح کے بھیس میں نظر آتا ہے کبھی واعظ کے رنگ میں جلوہ دکھاتا ہے اور کبھی قیس و فرہاد کی طرح جیب و دامن کی دھجیاں بھی اُڑاتا ہے۔ دراصل عشق انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے اور یہ جذبہ انسان کے سارے جذبات میں لطیف ترین ہے۔ بہار صاحب کے حصّے میں بھی جذبۂ عشق آیا ہے۔ اُن کے عشق سے خلوص و وفا مُشک کی طرح مہکتا ہے۔ وہ محبُوب سے سچّی محبّت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس کی یاد کے سہارے اپنی زندگی کے تلخ لمحات گزارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چُنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ ؎

اِک چوٹ جگر پہ پھر نئی کھائی ہے   پھر دل میں تری شکل اُتر آئی ہے
ماتھے پہ بھڑک اُٹھے ہیں یادوں کے چراغ   بجلی سی مرے ذہن میں لہرائی ہے

ہر نقشِ حزیں دل سے مٹا دیتا ہوں   ہر تلخیٔ دوراں کو بُھلا دیتا ہوں
ماحول سے جس وقت گھُٹن ہوتی ہے   گزرے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہوں

بہار صاحب عشقِ محبوب میں غرق ہیں۔ اُن کو محبُوب کی ہر ادا پسند ہے۔ اس لئے وہ اپنی رُباعیات میں محبُوب کا سراپا بھی پیش کرتے ہیں۔ اِس سے قبل رُباعیات میں محمد قلی قطب شاہؔ اور نظیرؔ اکبرآبادی سراپا پیش کر چکے ہیں۔ پھر دَورِ جدید میں جوشؔ اور فراقؔ نے اس موضوع کی طرف توجہ کی ہے۔ خصوصًا فراقؔ نے محبُوب کے مختلف اعضا کی جسمانی تصویر دلکش رنگوں کے ساتھ کھینچی ہے۔ بہار صاحب کے سراپا میں فراقؔ کی رُباعیوں کا رس شامل ہے۔ بہار صاحب کے لئے یہ قابلِ فخر بات ہے کہ وہ فراقؔ کی سی رَسیلی رُباعیات کہنے میں

کامیاب ہوئے ہیں۔ بہار صاحب کی دو رُباعیات سے لُطف اُٹھائیے ؎

ڈوبا ہوا رس میں وہ تکلّم ہے ہے ۔۔۔ پُرکیف صدا میں وہ ترنّم ہے ہے
اُن مدھ بھری آنکھوں میں جوانی کا خُمار ۔۔۔ ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسّم ہے ہے

یہ رُوپ، یہ رنگ، یہ نزاکت، یہ لچک ۔۔۔ آنکھیں جادُو بھری، یہ گالوں کی مہک
سر تا بہ قدم ایک قیامت کہیئے ۔۔۔ ترشے ہوئے یہ ہونٹ، یہ دانتوں کی چمک

بہار صاحب کی عشقیہ رُباعیات میں ایک لفسیاتی نکتہ بھی موجود ہے۔ اُن کی رُباعیوں میں جا بجا اصولِ استحصال (contiguity theory) کار فرما نظر آتا ہے۔ اُن کو فطرت کے حسین سنّاٹے محبوب کی یاد دلاتے ہیں۔ اس طرح ایک تصویر دُوسری تصویر کو اُبھارنے کی کوشش کرتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ؎

آکاش پہ جس وقت گھٹا آتی ہے ۔۔۔ کُہسار سے جس وقت ہوا آتی ہے
چھا جاتا ہے آنکھوں میں تصوّر تیرا ۔۔۔ دل سے تری ہر وقت صدا آتی ہے

بہار صاحب نے منظریہ رباعیات بھی کہی ہیں۔ ان رباعیات میں فطرت کا حُسن و جمال انگڑائیاں لے رہا ہے۔ ہم فطرت کے لب و رُخسار اور زلف و کاکل کا جلوہ اُنکی رُباعیات میں دیکھ سکتے ہیں اور محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اس سے قبل فطرت کی حسین تصویر ہم کو اثر لکھنوی اور جوش ملیح آبادی کے یہاں ملتی ہے۔ بہار صاحب کی رُباعیات میں بھی فطرت کا سرور و کیف اور حُسن و شباب موجود ہے۔ بہار صاحب کی مندرجہ ذیل رُباعیات منظریہ اعتبار سے بہت اہم ہیں ؎

ترکتی ہیں ساون کی فضائیں اے دوست ۔۔۔ چلتی ہیں طرب خیز ہوائیں اے دوست

کروٹ لے لے کے جاگ اُٹھتا ہے نصیب　　اُٹھتی ہیں وہ رُوح سے صدائیں اے دوست

بادل ہے کہ اُڑتا ہوا میخانہ ہے　　ندّی ہے کہ چھلکا ہوا پیمانہ ہے
ساون کی ہے یہ شام کہ ہے صبحِ ازل　　کیا خوب یہ فطرت کا پری خانہ ہے!

وہ رنگِ شفق دیکھئے ہلکا ہلکا　　جیسے مئے گلرنگ کا ساغر چھلکا
خورشید کا عکس یوں نظر آتا ہے　　جیسے کسی گلفام کا آنچل ڈھلکا

بہار صاحب نے مختلف موضوعات پر رُباعیاں کہی ہیں اور انھوں نے ہر موضوع میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اگرچہ وہ ازراہِ انکسار کہتے ہیں ؎

مَیں مصحفی و میر کا ثانی نہ سہی　　محروم و فراق، اصغر و فانی نہ سہی
تصویر ہیں اس عہد کی میرے اشعار　　اِن میں وہ بلاغت، وہ روانی نہ سہی

حقیقت یہ ہے کہ بہار صاحب کی رُباعیات میں بلاغت بھی ہے اور روانی بھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ فی الحال مصحفی، میر، فراق، اصغر اور فانی کے ہم پلّہ نہیں ہیں مگر اُن کے ذوق و شعور کی بنا پر اُمید کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ مستقل مشق کرتے رہے تو کسی روز منزلِ مقصود پر پہنچ جائیں گے اور پھر وہ اِن شعراء میں سے کسی بھی شاعر کا مقام حاصل کرلیں گے۔

مَیں بہار صاحب کی نکہت و نور میں بسی ہوئی رُباعیات سے بہت محظوظ ہوا ہُوں۔ مجھے اُمید ہے کہ میری ہی طرح رُباعی کا ذوق رکھنے والے دیگر حضرات کو بھی بہار صاحب کی رُباعیات میں لالہ و گل اور نسرین و نسترن کی خوشبو محسوس ہوگی

سلام سندیلوی
شعبۂ اُردو گورکھپور یونیورسٹی، گورکھپور

یہ رُباعیاں

(مصنّف)

جدید شاعری پر بحث کرتے ہوئے بیسویں صدی کے ممتاز مصنف ڈی۔ ایچ۔ لارنس (D.H Lawrence) یوں رقم طراز ہیں:۔

The essence of poetry with us in this age of stark and unlovely realities is a stark directness without a shadow of lie or a shadow of deflection anywhere. This stark, bare, rocky directness of statement, this alone makes poetry today.

اور اس ضمن میں دورِ جدید کے مشہور ادیب آلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) فرماتے ہیں:۔

I like things to be said with precision and as concisely as possible.

مذکورہ بالا انگریزی اقتباسات میں الفاظ Directness of statement اور Concisely .... قابلِ غور ہیں اور دیگر اصنافِ سخن کے بجائے میرا رُباعی کو ذریعۂ اظہار بنانے کا کسی حد تک جواز پیش کرتے ہیں۔ رباعی براہِ راست شاعری کا آلۂ کار

ہے اور اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ لہٰذا میں جب کبھی کسی واقعہ سے متاثر ہوا یا میں نے کسی بات کو شدّت سے محسوس کیا تو کم سے کم الفاظ سے کام لے کر ایک خیال، جذبے یا مُوڈ کو رباعی کے چوکھٹے میں باندھنے پر اکتفا کیا اور بات کو خواہ مخواہ طول دیئے جانے سے احتراز کیا ہے۔

آج کے اقتصادی اور مادّی دَور میں نہ شاعر کو اتنی فرصت ملتی ہے کہ وہ طویل اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کرے، نہ قاری کے پاس لمبی چوڑی نظمیں پڑھنے کا وقت ہے جس طرح آجکل کا مصروف انسان طویل ناول پر مختصر افسانے کو ترجیح دیتا ہے بعینہٖ اُسی بنا پر رُباعی بھی دورِ حاضر میں دیگر اصنافِ سخن سے ممتاز و ممیّز ہے۔

دُوسری اصنافِ سخن پر مجھے رُباعی کو ترجیح دینے کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ رُباعی میری اُفتادِ طبع سے عین موافقت رکھتی ہے۔ رُباعی ایک سنجیدہ صنفِ سخن ہے جو فکریہ شاعری کے لئے مخصوص ہو گئی ہے۔ عصرِ حاضر پر اپنے شذرات پیش کرتے ہوئے ....
Albert Schweitzer (البرٹ شوئٹزر) فرماتے ہیں:۔

With the spirit of the age I am in comp-
lete disagreement because it is filled with
disdain for thinking.

اگر آج کے ادیب کو واقعی اپنی ذمّہ داری کا احساس ہے تو نئی نسل کے قارئین میں سوچنے کی عادت ڈالنے کا کام اُسے اپنے ذمّے لینا ہو گا اور اس کے لئے لازم ہے کہ وہ کوئی اہم بات اِس انداز سے کہے کہ قاری کے ذہن کو جھٹکا لگے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جائے۔ رُباعی اس لحاظ سے بھی میری محبوب صنفِ سخن ہے کہ اِس میں فکری رُجحان کا

پہلو نمایاں ہے۔ مَیں کوئی بڑا مفکر، فلسفی یا دانائے راز ہونے کا ہرگز مدّعی نہیں ہوں مَیں نے اِن رُباعیوں میں کوئی مسلسل فلسفہ یا نظریۂ حیات پیش کرنے کی قصداً کوئی کوشش نہیں کی۔ نہ اس خصوصیت کو محاسنِ شعری میں شمار کرتا ہوں کہ شعر فلسفہ یا نظریئے کے بوجھ تلے دب جائے تاہم فکری گہرائی کا ہونا میرے نزدیک شعر کا جُزو لاینفک ہے۔ اُمید ہے کہ ان رُباعیوں میں احساس و جذبے کے ساتھ فکر و شعوُر کی آمیزش بھی آپ پائیں گے۔ مَیں ایچ۔ جی۔ ویلز اور جارج برنارڈ شا کی طرح تفریح کے لئے قلم اُٹھانا گناہ تو نہیں سمجھتا۔ ذوقِ جمال کی آسودگی اور ذہنی انبساط اچھے شعر و ادب کی پہلی شرط مانتا ہوں۔ مگر صحیح قسم کی صحت مند ذہنی انبساط اُس شعر سے مِل سکتی ہے جس میں جذبات اور افکار کی رعنائی ہو۔ صرف لذّتِ کام و دہن کا سامان فراہم کرنا ہی کافی نہیں۔ نیز یہ بھی میرا عقیدہ ہے کہ ادبِ عالیہ ہمیشہ کسی تعمیری پہلو کا حامل ہوتا ہے۔

یہ بجا ہے کہ ایک اچھے فن پارے میں جمالیاتی قدروں کی موجودگی ناگزیر ہے۔ رومانوی عناصر کی شمولیت بے شک کلام کو تاثیر اور دلآویزی بخشتی ہے۔ رومانوی تشنگی کو سیراب کرنے کا مواد بھی مہیا کرنا ضروری ہے۔ عشقیہ شاعری کرنا کوئی جرم نہیں بشرطیکہ وہ خلوص اور صداقت پر مبنی ہو۔ مَیں نے بھی حُسن و عشق کے لئے رباعیوں کا ایک باب مخصوص کیا ہے۔ زندگی میں یا شاعری میں عشق کی اہمیت سے انکار کرنا تو نا روا ہوگا مگر زندگی کے دُوسرے تقاضوں کو نظر انداز کر کے صرف حُسن و عشق کے گیت ہی الاپتے رہنا میں کافی نہیں سمجھتا۔ عشق کے علاوہ دیگر موضوعات کا بھی ایک لامتناہی ذخیرہ قدم قدم پر شاعر کی دُور رس نظر کا منتظر ہے۔ ہمیں شاعرِ رومان جان کیٹس (John Keats) کا یہ قول نہیں بھولنا چاہئے:

The poetry of earth is never dead.

میں کوئی مُصلح یا ناصح تو نہیں اور نہ ورڈز ورتھ (Wordsworth) کی
طرح یہ کہنے کو تیار ہوں کہ I am a teacher or nothing تاہم
مَیں نے عہدِ حاضر میں اخلاقی قدروں کے فُقدان کا ماتم ضرور کیا ہے۔ ایک ذمہ دار شاعر
کے لئے مَیں سماجی شعور (Social awareness) از حد ضروری سمجھتا ہوں اور
اس سلسلے میں انگریزی شاعر شیلے (Shelley) کو آدرش مانتا ہوں جو سیاسی جماعتوں
اور مذہبی عقائد سے بالا اور بے نیاز ہو کر بھی تازیست انقلاب اور اصلاح کا
علمبردار رہا اور جس کی بہترین غنائی نظمیں سماج کو سُدھارنے اور مظالم کا خاتمہ کر دینے
کے جذبے سے معمور ہیں۔ شیلے کی شاعری میں زندگی اور انسانیت کی اعلیٰ قدروں کی
نمائندگی ملتی ہے اور وہ غنائی، رُومانی اور انفرادی ہوتے ہوئے بھی انقلابی، سماجی اور
اصلاحی ہے۔ مَیں شیلے کی طرح شاعری میں فکر اور جذبہ، دونوں کو گھلا کر ایک کر دینے
کا قائل ہوں اور نغمگی کو اُس کا لازمی جُز و گردانتا ہوں۔ شیلے کی طرح مَیں نے بھی کسی
سیاسی یا مذہبی جماعت سے مُنسلک ہوئے بغیر اپنے وقت کے مُلکی، سماجی اور اقتصادی
حالات کا حتی المقدور احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دَورِ حاضر کے اس بڑے المیہ
کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ اتنی جسمانی آسائشوں اور مادّی سہولتوں کے باوجود آج
کا انسان اس قدر رُوحانی کرب اور سراسیمگی کا شکار ہے۔ انسان کی حالت پر گاہے
رو کر اور گاہے ہنس کر مَیں نے اس کا ضمیر جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ مَیں شاعر کو کوئی
بھانڈ، مسخرا یا لطیفہ گو نہیں سمجھتا۔ شاعری ایک سنجیدہ فن ہے اور میتھیو آرنلڈ....
(Matthew Arnold) نے بجا طور پر اس کے لئے بے غایت سنجیدگی....

(High seriousness) کا ہونا لازمی قرار دیا تھا تاہم کئی بار طنز و مزاح کا حربہ بلا درنغ وہ کام کر جاتا ہے جو گریہ و زاری سے نہیں ہو پاتا بشرطیکہ وہ تعمیری پہلو کا حامل ہو۔ صرف شیخ کی داڑھی پر روایتی انداز میں پھبتیاں کسنے سے کوئی مفید مقصد حل نہیں ہو سکتا۔ تقسیمِ وطن کے بعد ہمارے مُلک میں مختلف پیشوں اور جماعتوں کا جو نقشہ اُبھرا ہے میں نے ہلکے پھلکے انداز (Light vein) میں مگر پوری ذمہ داری کے ساتھ چند طنزیہ رُباعیوں میں اُس کا چربہ اُتارنے کی جسارت کی ہے۔ اپنے مشہور سانیٹ To Milton میں انگریزی شاعر ورڈز ورتھ اپنے ہم وطنوں کی پست حالت اور اخلاقی گراوٹ کا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

Milton, thou should be living at this hour
England hath need of thee; she is a fen
Of stagnant waters: altar, sword and pen
Fire side, the heroic wealth of hall and bower
Have forfeited their ancient English dower
Of inward happiness. We are selfish men.

اگر آپ مُلک کی تقسیم کے عظیم حادثے کے بعد اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو آپ کو بھی کچھ اسی طرح کے حالات نظر آئیں گے۔ مَیں نے اس افسوسناک صورتِ حال کا اور ہر شعبے میں اخلاقی گراوٹ کا ذکر کچھ طنزیہ رباعیوں میں کیا ہے، مگر اس سے کسی کی دل شکنی مقصود نہیں اور نہ مَیں نے افراد یا ذاتیات پر حملہ کیا ہے بلکہ سماجی شعور رکھنے والے ایک شاعر کی حیثیت سے ایک قومی اور ادبی ذمّہ داری سے سُبکدوش ہونے کی کوشش کی ہے۔ اِن دگرگوں حالات کو دیکھ کر مصلحتاً خاموش رہنا میری نظر میں اپنے

فرض سے آنکھ چرانے کے مترادف ہوتا۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ میری اس ادبی کاوش میں آپ کو حب الوطنی کا جذبہ کارفرما ملے یا اس جرأت رندانہ کے لئے آپ مجھے گردن زدنی اور معتوب قرار دیں۔

دنیائے ادب میں آپ کو اکثر و بیشتر ہر دور میں دو قسم کی آوازیں سنائی دیں گی۔ مثلاً اگر آپ انیسویں صدی کے انگریزی ادب کا مطالعہ کریں تو آپ کو ایک طرف تو ملک الشعراء لارڈ الفرڈ ٹینی سن برٹش طرزِ حکومت، جمہوریت اور روز افزوں مادّی خوشحالی کے گن گاتا دکھائی دے گا، دوسری طرف آپ کو رسکن، کارلائل، میتھو آرنلڈ، چارلس ڈکنس اور مسز براؤننگ جیسے حسّاس قلم کار اس کھوکھلی مادّی ترقّی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آئیں گے اور اس سطحی آسودگی کو بے نقاب کرتے، حق اور مساوات کا نعرہ لگاتے اور سماجی مظالم اور بے انصافیوں کے خلاف سینہ سپر رہتے دکھائی دیں گے۔ دراصل موخر الذکر ادیبوں کا باغیانہ لہجہ زیادہ تلخ و ترش مگر زیادہ موثر اور دلدوز ہے، کیونکہ ان کی صدائے احتجاج خلوص پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان ادیبوں کا جذبۂ حب الوطنی ٹینی سن سے کسی طرح بھی نچلے درجہ کا نہیں تھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ ایک ادیب ہر وقت اور ہر چیز پر نکتہ چینی ہی کرتا رہے مگر ضروری بات یہ ہے کہ جو کچھ وہ دیانتداری اور شدّت کے ساتھ محسوس کرتا ہے وہی اُسے بلا خوف و خطر نوکِ قلم پر لانا چاہیئے۔ An artist must be true to his vision

کبوتر کی طرح بلّی کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینے سے خطرہ سر سے ٹل تو نہیں جاتا۔ بیشک یہ امر ہمارے لئے باعثِ مسرت و تسکین ہے کہ ہم نے آج سے تقریباً ایک چوتھائی صدی پہلے اپنی گردن سے غلامی کا طوق اُتار کر پھینک دیا تھا اور اب ہم ایک آزاد ملک کے

باشندے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے غلامی کو ختم کر دینے کے بعد غلامانہ ذہنیت سے بھی نجات پالی ہے۔ کیا یہ چور بازاری، نفع خوری، مال اندوزی، رشوت ستانی، فرقہ پرستی، صوبائی اور لسانی تعصب، تنگ نظری اور باہمی نفاق ایک آزاد ملک کے باشندوں کے شایانِ شان ہیں۔ کیا ان تخریبی رجحانات سے ہماری آزادی کو خطرہ لاحق نہیں ہے۔ کیا ایک آزاد ہندوستان کا یہی خواب ہم نے دیکھا تھا۔ ہمارے قومی رہنما یہ کہتے کہتے دُنیا سے چلے گئے کہ ہماری آزادی اُس وقت تک ادھوری سمجھی جائے گی جب تک مُلک میں بھوک، افلاس، بیماری، بیکاری اور جہالت کا دَور دَورہ ہے۔ اور ابھی تک بیرونی خطرہ بھی تو ہمارے مُلک کو برابر گھیرے ہوئے ہے۔ اگر ان اندرُونی اور بیرونی خطرات سے ایک شاعر قوم کو آگاہ نہیں کرے گا، سماج دشمن عناصر کے خلاف ایک ادیب صدائے احتجاج بلند نہیں کرے گا اور امن، مساوات اور خوشحالی کا عہدِ زرّیں لانے کے لئے خیر سگالی کی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط نہیں کرے گا تو اس کارِ خیر کے لئے اور کون آگے بڑھے گا۔

ایک سچّا فن کار عصری تقاضوں سے کبھی گریز نہیں کر سکتا۔ وہ حق اور انسانیت کی آواز بلند کئے بغیر نہیں رہے گا۔ چاہے اس جرأت اور بیباکی کے لئے اُسے کچھ بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ ٹینی سن (Tennyson) نے اپنی مشہور نظم پیلیس آف آرٹ (The Palace of Art) میں ایسے فن کاروں کا عبرتناک انجام دکھایا ہے جو سماج سے اپنا ناطہ توڑ کر الگ تھلگ اپنی ایک تصوراتی دُنیا بسا لینا پسند کرتے ہیں۔ فن، کا زندگی سے گہرا تعلق ہے اور جو فن کار اپنے گرد و پیش سے آنکھیں موند لیتا ہے، اور اپنے ماحول کو بہتر دیکھنے کی خواہش نہیں رکھتا وہ مشاعروں میں بھلے

ہی داد لوٹ لے لیکن ادب کے مورخین اُسے ادیبوں کی صف میں کوئی مقام دینے کو تیار نہیں ہوں گے۔

ہنگامی حالات اور واقعات سے متاثر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ دائمی قدروں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ مَیں نے جو اخلاقی اور قومی رُباعیاں کہی ہیں، یا جن رُباعیوں میں بیسویں صدی کے انسان کی تصویر پیش کی ہے اُن میں نہ صرف ماحول اور وقت کی عکاسی ہے بلکہ دائمی قدروں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ طنزیہ رُباعیوں میں مختلف شعبوں کی جو تصویریں پیش کی گئی ہیں اُن کی محض وقتی اپیل ہی نہیں ایک لحاظ سے یہ تصویریں زمان و مکان کی قید سے آزاد بھی ہیں۔ ہر عہد اور ہر مُلک میں جہاں آپ کو گنتی کے ضمیر پرست (Conscientious) حکّام، ڈاکٹر، معلّم اور طالب علم نظر آئیں گے ساتھ ہی آپ کو ایسی سیاہ بھیڑیں (Black sheep) بھی خاصی تعداد میں ملیں گی جو اپنے پیشے اور اپنے مُلک کے نام پر دھبّہ ہیں۔ مَیں نے اپنی طنزیہ رباعیوں میں صرف اِن سیاہ بھیڑوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے تاکہ وہ اپنی مکروہ صُورت دیکھ کر مناسب اقدام کریں اور نحوست دور ہو سکے۔ چند دیگر رُباعیاں جن میں صرف مزاح کی چاشنی کے ساتھ واقعہ نگاری کی گئی ہے نیش و نشتر سے مبرّا ہیں۔ اس کے برعکس کئی سنجیدہ رُباعیوں میں بھی طنزیہ پہلو نمایاں ہے۔

میں نے سائنس، سماج اور مختلف تحریکوں اور اداروں کا جائزہ لیتے ہوئے حتی الوسع غیر جانبداری سے کام (detached view) لینے کی کوشش کی ہے۔ ان میں مُجھے جو پہلو ملک اور بنی نوع انسان کے مفاد کے منافی نظر آیا اُس پر میں نے بھرپور وار کیا ہے مگر ساتھ ہی ان میں جو بات مجھے اچھی لگی اُسے دل کھول کر

سراہا ہے۔ مثلاً مختلف قومی تحریکوں میں سے مجھے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام نے خاص طور پر متاثر کیا لہٰذا میں نے چند بزرگوں اور کرم فرماؤں کے پروٹسٹ کے باوجود فیملی پلاننگ پر رُباعیاں کہی ہیں۔ اسے حکومت کے حق میں محض پروپیگنڈہ سے تعبیر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اس سلسلے میں بھی میں نے جو کچھ دیانتداری اور شدت کے ساتھ محسوس کیا وہی اپنی رباعیوں میں کہا ہے۔ نصف درجن بچّوں کے باپ کی حیثیت سے مَیں نے اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر محسوس کیا کہ بڑا کنبہ خوش حالی اور ذہنی آسودگی کے منافی ہے اور پھر یہ دن بدن بڑھتی ہوئی آبادی کرۂ ارض پر بنی نوعِ انسان کے احیاء و بقا کے لئے کوئی معمولی خطرہ نہیں ہے۔[1]

مَیں شاعری میں وارداتِ قلبی کی ترجمانی کو بھی وہی اہمیّت دیتا ہوں جو ماحول کی عکاسی کو۔ سیاسی اور سماجی شعور رکھنے سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ شاعر اپنی ذات کو پسِ پُشت ڈال دے۔ بلاشبہ اپنی ترجمانی سے ہی شاعر انسانیت کا ترجمان بن سکتا ہے۔ لہٰذا اِن رُباعیوں کی ایک بڑی تعداد میں آپ کو میرے ذاتی جذبات، تجربات اور مشاہدات کا اظہار ملے گا بلکہ مَیں تو یہ کہوں گا کہ میرے سارے کلام میں آپ کو شاعر کی ذات ہی عکاس نظر آئے گی۔ مختلف اوقات پر مختلف لوگوں اور مختلف واقعات نے میرے دل پر جو گہرے تاثرات چھوڑے

---

[1] خاندانی منصوبہ بندی کے عنوان سے چھبیس رُباعیوں اور ایک طویل نظم پر مشتمل میرا مجموعہ کلام علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر گیان چند جین کے ایما پر یہ رُباعیاں "نسیمِ بہار" میں شامل نہیں کی گئیں۔ بہار

ہیں۔ میرے اشعار انھیں کا ردِعمل ہیں۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ تقریباً ہر شعر کے پیچھے کوئی داستان پوشیدہ ہے یا کوئی خاص واقعہ یا حادثہ اس کا محرک تھا تو شاید "کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ" والی بات ہوگی۔ تاہم میرے کئی احباب اور کرم فرما جب اس مجموعے کا مطالعہ کریں گے تو عین ممکن ہے انھیں کوئی بھولا بسرا واقعہ یاد آجائے۔ کوئی شعر پڑھ کر زیرِ لب مسکرا دیں یا ماتھے پر شکن ڈال کر سر کھجلانے لگیں۔ چنانچہ میں نے ایک طرف ماحول کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف اپنی ذات کی ترجمانی۔ بلکہ ماحول اور ذات کے تصادم کو میری شاعری کا بنیادی عنصر (Keynote) سمجھئے گا۔

ذات اور ماحول کی اس ناموافقت سے میرے کلام میں قدرے تلخی اور یاسیت کا آجانا لازمی تھا۔ میں نے ان رباعیوں میں جگہ جگہ اپنے ماحول اور زمانے کے حالات سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ مدت گزر گئی لیکن ابھی تک نہ لاہور کی یاد بھلا سکا ہوں، نہ والدین کی مفارقت کا داغ سینے سے مٹ پایا ہے[1]۔ آزادی کی اتنی بھاری قیمت چکا کر بھی ہم نے مستقبل کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر کے انتظار میں آنکھیں پتھرا گئیں مگر بات وہیں کی وہیں رہی بلکہ ۱۹۴۷ء کا بٹوارہ تقسیم در تقسیم کا پیش رو ثابت ہوا اور ہمیں کبھی یہاں کبھی وہاں پناہ لینی پڑی۔ میری رباعیوں کی ایک کثیر تعداد اس قسم کے اور دیگر زخم خوردہ جذبات کی آئینہ دار

---

[1] اس المناک سانحہ کا ذکر پہلے پہل ۱۹۴۷ء کے اواخر میں میں نے کچھ قطعات میں کیا تھا جو "تیج" دہلی میں منشی تلوک چند محروم عرش آشیانی کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ بہار

ہے۔ایک بہتر نظام دیکھنے کی تڑپ نے بھی رُوح کو ہمیشہ بیقرار رکھا جس میں ہر انسان
امن اور سکون کی زندگی بسر کر سکے اور محبت و اخوت کا دَور دَورہ ہو۔ لہٰذا میری یہ رُباعیاں
نہ صرف ذاتی اُداسیوں اور نارسائیوں کی داستان ہیں بلکہ موجودہ دَور کی ذہنی پراگندگی
اور ناآسودگی کی بھی نشان دہی کرتی ہیں۔ اس صورت میں کبھی کبھار لہجے کی تلخی ناگزیر تھی۔
لیکن یہ وہ تلخی ہے جس میں بنی نوع انسان سے ہمدردی کا جذبہ پنہاں ہے اور
مسموم فضا سے نجات پانے اور دوسروں کو نجات دلانے کی اُمنگ بھی ہے۔ ہر
قابلِ ذکر فن کار کے دل میں نہ صرف یہ جذبہ کارفرما نظر آئے گا بلکہ وہ دوسروں میں بھی
یہی تڑپ اور ماحول سے بے اطمینانی کا جذبہ بیدار کرنے کا خواہاں ہوگا۔ یہ تڑپ
اضطراب اور ماحول سے بے اطمینانی سماج کو بدل دینے کا پیش خیمہ ہُوا کرتی ہے۔
میرے غم میں اقبالؔ کا سوز، میرؔ کی نشتریت اور شیلےؔ کی سی تڑپ نہ سہی، لیکن اگر
آپ کو ان رُباعیوں میں اُسی بیتابی اور بے قراری کی ہلکی سی جھلک بھی نظر آجائے تو میں
اپنے غم کو ایک بہت بڑی دولت سمجھوں گا اور اپنی ادبی کاوش کو بار آور تصوّر کروں گا۔
مُجھے زندگی میں قدم قدم پر تلخ تجربات اور حادثات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ قدرتی
طور پر میری زندگی کی طرح میری شاعری میں بھی رنج و غم کا عنصر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے[1]۔

---

[1] میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے شاعری سے متعلق غیر شخصی نظریئے سے متفق نہیں ہوں۔ جن حضرات کا خیال
ہے کہ شاعر زندگی میں جو رنج و غم محسوس کرے اس کا اظہار شاعری میں نہ کرے وہ ارسطو کے بنیادی نظریۂ تنقیح
(Theory of Catharsis) کو بھول جاتے ہیں جو اس عظیم مفکّر نے ٹریجڈی کی حمایت میں
پیش کیا تھا۔ اس ضمن میں انگریزی کے مشہور نقاد جی۔ کے چیسٹرٹن (G. K. Chesterton) کا یہ
یہ قول بھی قابلِ ذکر ہے:- (باقی صفحہ ۳۰ پر)

مجھے اپنے حالات تو سدھرتے نظر نہیں آتے لیکن مَیں انسان کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تمام تر حادثات، آشوبِ روزگار اور زندگی کی گوناگوں پریشانیوں، اذیتوں اور صعوبتوں کے باوجود مَیں نے چند اردو اور انگریزی کے رومانوی شعراء کی طرح نہ تو زندگی کے کھیل میں ہار مانی اور نہ موت کو دعوت دی ہے میں نے اِن رباعیوں میں رنج و غم سے گھری ہوئی زندگی کی جا بجا جھلکیاں ضرور پیش کی ہیں۔ مگر موت کو غمِ زیست کا علاج مان لینے کے تصور سے مجھے نفرت ہے۔ یہ بجا ہے کہ انسان کو قدم قدم پہ ناکامیوں اور تباہیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کئی بار زندگی کی ٹھوکریں اور حوادث کے تھپیڑے کھاتے کھاتے ایک عمر گزر جاتی ہے اور پھر بھی کامیابی کا منھ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مگر انسانی روح کی عظمت اس میں ہے کہ کشمکشِ حیات میں مات کھا کر بھی ہار ماننے سے انکار کر دے اور تا دمِ زیست ناموافق حالات کا بقدرِ توفیق بہادری اور دیانتداری کے ساتھ سامنا کرتا رہے، رنج و غم و آلام کی اس بستی میں اوقات بسر کرنے کی تدبیر ڈھونڈے اور اُلجھنوں میں گھر کر بھی جینے کی راہ نکال لے۔ مَیں نے قدم قدم پر جو پیچ و تاب دیکھے ہیں اگر کوئی اور شخص ہوتا تو انھیں دیکھ کر شاید مدت سے اپنا گریبان چاک کر ڈالتا یا خودکشی کر لیتا، لیکن میں نے نامساعد

(بقیہ صفحہ ۲۹ سے آگے)

"A great poet means what he says whereas a small poet does not."

یعنی ایک قابلِ ذکر شاعر وہی بات کہتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس ایک ادنیٰ قسم کا شاعر ایسا نہیں کرتا۔

زندگی اور فن کو ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بہار

حالات سے لڑنا سیکھا ہے اور شاعری میں اسی بات کی تلقین کی ہے۔ نیز ماحول کو بہتر دیکھنے کا جنون مجھ پر ہمیشہ سوار رہا ہے اور رہے گا۔

میں ادب کو خانوں میں بانٹنے کا قائل نہیں ہوں۔ شاعر جن خارجی واقعات سے متاثر ہوتا ہے ان کو اپنے اندر سمو کر احساسات کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لہٰذا شاعری میں خارجی اور داخلی کی تمیز مجھے بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح مجھے کلاسیکی اور رومانی شاعری، ترقی پسندی اور جدیدیت کی حدیں بھی آپس میں ملتی نظر آتی ہیں۔ ہر اچھے رومانی شاعر کے ہاں مجھے کلاسیکی ضبط و نظم کی تلاش کا جذبہ ملتا ہے۔ اور ہر جدید شاعر صحیح معنوں میں ترقی پسند ہوگا نہ کہ رجعت پسند۔ میرا اپنا اندازِ بیان اور اسلوب جہاں کلاسیکی ہے، جذبہ رومانوی ہے۔ نیز ترقّی پسندوں کی طرح میں نے بھی بار بار اس امر پر جھلّاہٹ کا اظہار کیا ہے کہ انسان نے انسان کو کیا بنا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جدید شعرا کی طرح میری شاعری کیفیات، تاثّرات اور احساسات کی شاعری ہے۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ کئی نئے لکھنے والے شاعروں کی طرح میں اپنی بات کنایوں یا علامتوں (images and symbols) کی صورت میں کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں رمزیہ اندازِ بیان اختیار کرنے کے بجائے نہایت واضح الفاظ میں اپنی بات عوام تک پہنچانے کا متمنّی ہوں۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا تھا ؎

سعدیا چنداں کہ می دانی بگو

حق نشاید گفتن الّا آشکار!

جدید شعراء کی ابہام پسندی اور اُن کی فنّی بے راہ روی سے میں اتنا ہی بیزار ہوں

جتنا رنگِ قدیم میں لکھنے والوں کی فنی قلابازیوں اور الفاظ کی بازی گری سے ، اکثر و بیشتر جدید شعرا ابہام کے جواز میں طرح طرح کی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ لیکن اگر شاعر کی دانستہ طور پر یہ کوشش رہے کہ "کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی" تو پھر قلم اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اپنی غنائی نظموں کے دیباچے میں مشہور انگریزی شاعر اور نقّاد ولیم ورڈز ورتھ فرماتے ہیں۔

Poets do not write for poets alone, but for men. Unless therefore we are advocates for that admiration which subsists upon ignorance, and that pleasure which arises from hearing what we do not understand, the poet must descend from this supposed height, and in order to excite rational sympathy, he must express himself as other men express themselves.[۱]

اس سلسلے میں بین الاقوامی شہرت کے روسی ادیب ٹالسٹائی Tolstoy پر ہنری تھامس اور دانا لی تھامس کے تحریر کردہ مضمون سے بھی ایک مختصر سا اقتباس پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا :-

"...... He found them to be an uncongenial

---

۱ Preface to Lyrical Ballads by William Wordsworth

lot of snobs. They wrote for the Intelligentsia, and looked upon the rest of mankind as unworthy to share in their exalted ideas. But Tolstoy's attitude was just the opposite of this. Literature to him was a religion, a holy gospel of beauty and wisdom that must become the common possession of all. Instead, therefore, of writing to entertain the few, he wrote to educate the many."

اپنی اردو رباعیوں کے دیباچے کو انگریزی شعراء اور دوسرے ادیبوں اور نقّادوں کے اقتباسات سے بوجھل بنانے کا میرا ارادہ ہرگز نہیں تھا۔ مگر ایسا کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ ادب میں ابلاغ و ترسیل نیز ہیئت اور زبان کا مسئلہ بڑا اہم ہے اور اپنے ہم عصر شعرائے کرام کی توجہ میں نے اس امر کی طرف میذول کرنا ضروری سمجھا کہ ایک طرف تو شیخ سعدی، ورڈز ورتھ، تلسی داس، سورداس، میر اور نظیر اکبرآبادی ہیں جن کی زبان تدنیں گزر جانے کے بعد بھی سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور ادھر یار لوگ ہیں جن کا کلام سمجھنے سے اُن کے اپنے عہد کے تعلیم یافتہ قارئین بھی قاصر ہیں

Words are becoming catchphrases to hide what one really thinks, instead of laying bare what one really means. The purpose of

expression is to reveal primarily, not to conceal ultimately

آخر الفاظ خیال کے اظہار کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ اُسے چھپانے کے لئے۔ اگر ہم واقعی اُردو زبان کے احیاء و بقا کے صدقِ دل سے خواہش مند ہیں تو ہمیں شعری، ادب اور زبان میں حالات کے مطابق مناسب تبدیلی لانا ہوگی اور زبان کو سلیس تر اور عام فہم بنانے کی کوشش اُردو زبان اور ادب کی اس نازک وقت میں بہت بڑی خدمت ہوگی۔[1]

مَیں نے اِن رُباعیوں میں اکثر و بیشتر دورِ جدید کے مسائل نظم کئے ہیں۔ اور ایک قدیم ترین صنفِ سخن کو جدید ترین موضوعات اور افکار کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔ نئے شیشوں میں پُرانی شراب ڈھالنے کا محاورہ آپ نے سُنا ہوگا۔ مَیں نے اس کے برعکس پُرانے شیشوں میں نئی شراب اُنڈیلنے کی کوشش کی ہے دیکھنا یہ ہے کہ پُرانے شیشوں میں نئی شراب نوش کر کے آپ کو کتنا سرور آتا ہے۔ یہ صرف میرا ہی امتحان نہیں، اگر میری یہ کوشش آپ کو اچھی لگی تو یہ پُرانے شیشوں کی پائیداری اور اُستواری کا بھی ثبوت ہوگا کہ ہزاروں سال گزر جانے کے بعد بھی اُن کی چمک دمک میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس بات کا فیصلہ اہلِ نظر پر چھوڑتا ہوں کہ رُباعی کے محدود کینوس پر مَیں فن اور زندگی دونوں کے تقاضوں کو کہاں تک پُورا

[1] مَیں رابرٹ فراسٹ کی طرح لحظہ بہ لحظہ بدلتی ہوئی کیفیاتِ دل (moods) اور زندگی کے پیچیدہ مسائل کو بھی سادہ اور موثر انداز میں پیش کرنے کا قائل ہوں۔ بہار

کر سکا ہوں۔ آئرلینڈ کے مشہور شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ژیٹس (W. B Yeats) نے اپنی نظم Adam's curse میں ایک بڑی پتے کی بات کہی ہے:۔

I said, "A line will take us hours may be;
Yet if it does not seem a moment's thought,
Our stitching and unstitching has been
naught."

یعنی ایک مصرع کہنے میں چاہے ہمیں گھنٹوں دماغ سوزی کیوں نہ کرنی پڑے اگر اسے پڑھ کر قاری کو آمد کی بجائے آورد کا گمان ہوا تو ہماری تمام کاوش رائیگاں سمجھی جائے گی۔ مجھے شاعری نہ تو ورثے میں ملی ہے، نہ میں اہلِ زبان ہوں اور نہ فن پر عبور رکھنے کا مدّعی۔ پھر عدیم الفرصت اتنا کہ اکثر کوئی شعر، غزل یا رُباعی کہے مہینے اور سال گزر جاتے ہیں۔ خرابیٔ صحت، سرکاری ملازمت، خانگی ذمہ داریوں اور مالی پریشانیوں نے کبھی چین کا سانس نہیں لینے دیا۔ اگر ورڈز ورتھ اور کئی دیگر خوش قسمت شعراء کی طرح فارغ البال ہوتا تو میں بھی جی بھر کے شعر کہتا اور فن کی باریکیوں کی طرف بھی توجہ دے سکتا مگر موجودہ حالات میں ڈاکٹر اقبال کی طرح دل میں یہ خدشہ محسوس کرتا ہوں کہ "کیا عجب آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصوّر نہ کریں اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجے کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے "اُردو رباعیات" پر اپنے گراں قدر تحقیقی مقالے میں (جس پر انہیں یونیورسٹی کی طرف سے پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا ہوئی ہے) بجا فرمایا

ہے کہ رُباعی کا پیکر بڑا ٹھوس اور دقّت طلب ہے۔ رُباعی ایسی کمر توڑ صنفِ سخن پر طبع آزمائی کرتے ہوئے یہ فرض کر لینا کہ میری رُباعیاں فنّی خامیوں سے مبرّا ہونگی خام خیالی ہوگی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار مرزا غالب بھی رُباعی گوئی میں لغزش کھا گئے تھے۔ میری رباعیوں میں بھی زبان و فن کی کئی لغزشیں تھیں جنہیں حضرت علامہ منوّر لکھنوی گاہ بگاہ سنبھالتے آئے ہیں۔ ممکن ہے پھر بھی کچھ خامیاں رہ گئی ہوں کیونکہ کسی بزرگ سے مشورہ کرنے کے بعد میں اکثر اپنی من مانی کیا کرتا ہوں فنّی پابندیوں کے سلسلے میں مَیں کچھ قدامت پسند واقع ہوا ہوں۔ تمام کی تمام رُباعیاں اس صنفِ سخن کی اصل بحر ہزج میں کہی ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور افسوس بھی کہ بعض شعرائے کرام قطعے کہہ کر انہیں رباعیوں کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ مگر قطعہ قطعہ ہے اور رُباعی رُباعی۔ قطعہ گوئی کے لئے مصرعوں کا وہ التزام اور بحر کی وہ پابندی نہیں ہے جو رُباعی گو شاعر پر عائد ہوتی ہے۔ حیران ہوں فنّی بے راہ روی کے اِس دَور میں جبکہ قطعہ اور رُباعی کا بنیادی امتیاز بھی سمجھنے والے خال خال نظر آتے ہیں۔ اُردو جاننے اور پڑھنے والوں کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا ہے اور سنجیدہ ادب کے مطالعے کا شوق ختم ہوتا جا رہا ہے میری فغانِ نیم شبی کون سُنے گا اور ادبی کاوشوں کی داد کون دے گا۔ مگر مرزا غالب کا یہ مصرع میرے ذہن کی رہنمائی کر رہا ہے ع

نہ ستائش کی تمنّا، نہ صلے کی پروا

امیر چند بہار
گورنمنٹ کالج، رہتک

عِلم واخلاق

(۱)

احباب سے جو شخص دغا کرتا ہے
اپنے حق میں ستم بپا کرتا ہے
ڈستا ہے اُسے سانپ کے مانند ضمیر
نشتر کی طرح دل میں چُبھا کرتا ہے!

(۲)

اَوروں کے لئے جال جو پھیلائے گا
اِک روز اسی میں خود بھی پھنس جائے گا
کر ترک روش یہ اپنی ، ورنہ برسوں
پچھتائے گا، پچھتائے گا، پچھتائے گا!

(۳)

بیداد سی بیداد بپا کرتا ہے
تُو کیوں یہ سلوکِ ناروا کرتا ہے
مظلوم کی آہوں سے نہ ہو یوں فی النّار
نادان ذرا سوچ یہ کیا کرتا ہے!

(۴)

دل جوئیِ مظلوم کا سامان بنو
اقدارِ جمیلہ کے نگہبان بنو
خوں خوار درندوں کا چلن یہ کیسا
تم اشرفِ مخلوق ہو، انسان بنو!

(۵)

ہم مہر و وفا، صدق و صفا بھول گئے
نیکی کا چلن، خوفِ خدا بھول گئے
کیا مارنے مرنے کا ہے سر میں سودا
صد حیف کہ جینے کی ادا بھول گئے!

(۶)

ہو محوِ سخن یا کوئی نغمہ گاؤ
دُنیا کو طرب زار بناتے جاؤ
خالق نے عطا کیا ہے انسان کا جسم
حیوان کی حرکتوں سے تم باز آؤ!

(۷)

یہ باہمی بُغض اور یہ کینہ چھوڑو
ناحق خُون دوسروں کا پینا چھوڑو
انسان کے طریق پر مناسب ہے، عمل
حیوان کی مانند یہ جینا چھوڑو!

(۸)

ذی ہوش ہو تُم صاحبِ فہم و اِدراک
خُونِ ناحق سے کیوں فضا ہے ناپاک
عہدِ زرّینِ امن واپس آجائے
صد چاک ہوں تاریخ کے خونیں اوراق!

(۹)

انسان کو اَوروں کا بھی لازم ہے خیال
دل توڑ کے خُود چَین سے جینا ہے محال
زندہ رہیں اور سب بھی، تم خُود بھی جیو
کیوں کشمکشِ زیست میں یہ جنگ و جدال!

(۱۰)

ماحول کو غمگین بناتے کیوں ہو

بے فائدہ اوروں کو ستاتے کیوں ہو

تہذیب و تمدّن کے علمبردار و

تہذیب کی یُوں خاک اُڑاتے کیوں ہو؟

(۱۱)

ہم ڈوبنے والوں کو سفینے دیں گے

مے اُنس کی انسان کو پینے دیں گے

آؤ کہ پھر اِک بار تہیّہ کر لیں

ہر شخص کو ہم چین سے جینے دیں گے!

(۱۲)

بے سُود ترقّی ہے یہ کلچر بیکار

یہ بیش بہا علم کا زیور بیکار

وُسعت سے دل و نظر اگر ہیں محرُوم

تہذیب و تمدّن ہیں سراسر بیکار!

(۱۳)

تہذیب نے کیا ہم کو سِکھائے اطوار
بہتر ہیں کہیں ہم سے تو ناخواندہ گنوار
ہم دیتے ہیں احباب کو دھوکا اکثر
وہ جان بھی احباب پہ کرتے ہیں نثار!

(۱۴)

بے کار ہے دُنیا میں شرافت کی تلاش
ناداں ہیں جو کرتے ہیں مروّت کی تلاش
جب تک دلِ انساں میں ہے نفرت باقی
بے سُود ہے احساسِ محبّت کی تلاش!

(۱۵)

ہے رُوحِ بشر کے لئے اُلفت اکسیر
ہوتی ہے محبّت میں بلا کی تاثیر
صادق ہے اگر جذبۂ اُلفت تیرا
کر سکتا ہے دشمن کے بھی دل کو تسخیر!

(۱۶)

انسان جو غُصّے میں کبھی آتا ہے
تہذیب کے معیّار سے گِر جاتا ہے
ہر حال میں قائم جو توازن رکھے
انسان وُہی اصل میں کہلاتا ہے!

(۱۷)

احسان کبھی کر کے جتانا نہیں اچّھا
احسان اُٹھاؤ تو بھُلانا نہیں اچّھا
محُسن نے مِرے دل پہ بِٹھایا ہے یہی نقش
احسان کسی کا بھی اُٹھانا نہیں اچّھا!

(۱۸)

اعلیٰ قدروں کی دل سے تائید کرو
مردانِ نکوکار کی تقلید کرو
اُستاد نے مُجھ کو یہ پڑھایا ہے سبق
بے خوف غلط بات کی تردید کرو!

(۱۹)

احسان سے غیر کے بچانا یارب
کشتی مری خود پار لگانا یارب
احباب کے آگے کبھی پھیلے مرا ہاتھ
یہ دن مجھے ہر گز نہ دکھانا یارب!

(۲۰)

رندانِ فلک ناز کے ہمدوش رہو
خُم خانۂ زندگی میں باہوش رہو
جس بزم میں ہاؤ ہُو تنک ظرف کریں
کھولو نہ زباں تم اُس میں خاموش رہو!

(۲۱)

اے مردِ خدا توڑ بھی دے ہر زنجیر
اپنا رستہ تلاش کر لے تاخیر
اوروں کے دکھائے ہوئے رستے پہ نہ چل
اُس پر عامل ہو جو کہے تیرا ضمیر!

(۲۲)

آتا ہے کسی قوم میں جس وقت زوال
رہ جاتی ہے بن کے دوسروں کی نقّال
تقلید کسی کی ہو، بُری ہوتی ہے
رہ رہ کے مِرے دل میں یہ آتا ہے خیال!

(۲۳)

اخلاق کا معیّار گرا دیتے ہیں
تہذیب کی بنیاد ہِلا دیتے ہیں
اِن فرقہ پرستوں سے خُدا ہی سمجھے
سوئے ہوئے فِتنوں کو جگا دیتے ہیں!

(۲۴)

وہ قوم کی کشتی کو ڈبو دیتے ہیں
سرمایۂ اجداد بھی کھو دیتے ہیں
کرتے ہیں مدام اپنا ہی اُلّو سیدھا
جان اپنے مفادات پہ جو دیتے ہیں!

(۲۵)

یہ وقت کی رفتار کو کیا سمجھیں گے
یہ وُقعتِ ایثار کو کیا سمجھیں گے
پیسے کے پجاری ہیں یہ، جانے دو انہیں
یہ عظمتِ کردار کو کیا سمجھیں گے!

عزم و عمل

(۱)

اے دوست یہ شغلِ مے وہ مینا ہے فرار
گھبرا کے غمِ دہر سے پینا ہے فرار
اُٹھ باندھ کمر اور ہو سرگرمِ عمل
مُردوں کی طرح دہر میں جینا ہے فرار!

(۲)

نادان! یہ قانونِ مشیّت ہے اٹل
غفلت ہے بشر کے لئے پیغامِ اجل
کیوں ہاتھ پہ یُوں ہاتھ دھرے بیٹھا ہے
یہ کارگہِ زیست ہے میدانِ عمل!

(۳)

ہمت سے ذرا کام لے اے مردِ خدا
بیکار ہے تیرا یہ مقدّر سے گِلا
معمار ہے خُود اپنے مقدّر کا بشر
ہے مرد تو بگڑی ہوئی قسمت کو بنا!

(۴)

سائے کی ضرورت ہے تو دیوار بنا
آرام کی خواہش ہے تو کچھ کر کے دِکھا
ہے دیر ضرور، لیکن اندھیر نہیں
مِل جائے گا اِک دن تجھے محنت کا صِلہ!

(۵)

جو قوم ہوئی طالبِ عیش و آرام
بن جائے گی اِک روز وہ غیروں کی غلام
تاریخ یہی ہم کو سِکھاتی ہے سبق
محنت سے بنا کرتے ہیں بگڑے ہوئے کام!

(۶)

اب پھینک بھی دو کاسۂ دریوزہ گری
ہو جائے یہ قوم اپنے پیروں پہ کھڑی
بھُولے سے بھی اَوروں کے نہ ہوں ہم محتاج
غیرت کا، حمیت کا تقاضہ ہے یہی!

(۷)

کچھ بھی ہو ہمیں اب تو سنبھلنا ہو گا
اِس قعرِ مذلّت سے نکلنا ہو گا
اِک عُمر رہے غیر کے ہم دست نگر
اب پاؤں سے خُود اپنے ہی چلنا ہو گا!

(۸)

ساقی ترے اِس جام سے اب کیا ہو گا
اِس بادۂ گُلفام سے اب کیا ہو گا
چھائے ہوئے ہیں جنگ کے کالے بادل
آسائش و آرام سے اب کیا ہو گا!

(۹)

زردار نے اندھیر مچا رکھّا ہے
پیروں تلے مُفلس کو دبا رکھّا ہے
اُٹھ اور بدل دے یہ نظامِ ہستی
اب نالہ و فریاد میں کیا رکھّا ہے!

(۱۰)

دُکھ لاکھ خموشی سے اُٹھائے ہم نے
بگڑے ہوئے حالات بنائے ہم نے
یُوں ہمّتِ مردانہ سے لیتے رہے کام
تقدیر کو بھی ہاتھ دِکھائے ہم نے!

(۱۱)

ہم سوختہ سامان جہاں جاتے ہیں
اپنے لئے دل شِکن فضا پاتے ہیں
اِس پر بھی نہیں ہارتے ہمّت اے دوست
کب ہم کسی اُفتاد سے گھبراتے ہیں!

(۱۲)

دل تیرِ نظر سے کبھی گھائل نہ ہُوا
مہ پاروں کی جانب کبھی مائل نہ ہُوا
مَیں جادۂ ہستی پہ رہا گرمِ سفر
رستے میں مِرے حُسن بھی حائل نہ ہُوا!

حالاتِ مہیب سے جو ڈر جاتے ہیں
موت آنے سے پہلے ہی وہ مر جاتے ہیں
دِل حوصلہ و عزم سے جِن کا ہے غنی
ہنس ہنس کے حوادث سے گزر جاتے ہیں!

دورِ حاضر

(۱)

وہ حُسن کے رنگین فسانے نہ رہے
وہ عشق کے دِلدوز ترانے نہ رہے
اللہ رے کیا دَورِ زبوں آیا ہے
وہ مہر و مروّت کے زمانے نہ رہے!

(۲)

سینوں میں ہے کس درجہ کدُورت کا غُبار
باقی ہی نہیں مہر و وفا کے آثار
اِس دَور کی تہذیب سے ہم باز آئے
اِس دَور سے ہے اپنی طبیعت بیزار!

(۳)

ذہنوں پہ ہے چھایا ہُوا بس خَوف و ہراس
ڈستا ہے دلوں کو بے کسی کا احساس
تسکینِ جگر کی کوئی صورت ہی نہیں
اِس دَور کا انسان ہے اِک پیکرِ یاس!

(۴)

ماحول سے ہر شخص کو دیکھا بیزار
اِس دَور میں ہو گیا جینا دُشوار
چھائے ہیں غم و رنج کے بادل سر پر
راحت کی تمنّا بھی ہوئی ہے آزار!

(۵)

جو شخص بھی مِلتا ہے، جہاں مِلتا ہے
فریاد بہ لب محوِ فغاں مِلتا ہے
اِس دَور میں کِس شخص کو حاصل ہے قرار
اِس دَور میں آرام کہاں مِلتا ہے!

(۶)

اب زہرہ جبینوں کا طلبگار ہو کون
معشوق کی زُلفوں میں گرفتار ہو کون
روٹی ہی کا مسئلہ نہیں حل جب تک
پھر جنسِ محبّت کا خریدار ہو کون!

(۷)

اِس دَور میں کردار کا فُقدان ہے کیوں
اخلاق سے بیگانہ ہر انسان ہے کیوں
ہرچند رہا ہے ارتقاء پر مائل
عادات و خصائل میں یہ حیوان ہے کیوں!

(۸)

حُکّام سے انصاف کی اُمّید نہ کر
احباب سے الطاف کی اُمّید نہ کر
ہوتے ہیں جو انساں کے لئے باعثِ فخر
اب اِس سے اُن اوصاف کی اُمّید نہ کر!

(۹)

اللہ رے اِس دَور کے سرمایہ دار
بدکیش، بداندیش، بدآئیں، بدکار
اخلاص و مروّت سے ہیں یکسر محرُوم
دولت کا ہے نشّہ اِن پر ہر وقت سوار!

(۱۰)

اب اہلِ ہُنر کی وہ مدارات کہاں
وہ مہر و مروّت کی روایات کہاں
ہے جاہ و زر و مال کی دُھن سب کو سوا
فن کار کی سُنتا ہے کوئی بات کہاں!

(۱۱)

ناپید ہوئے دہر سے آثارِ وفا
ملتے نہیں ڈھونڈے سے کہیں صدق و صفا
اِس دَور کے آئین پہ حیرت ہے مجھے
چوری بھی رَوا ہے سینہ زوری بھی روا!

(۱۲)

دلچسپ ہیں گو دَورِ طرب کی باتیں
کرتے ہیں مگر آپ یہ کب کی باتیں
جینا ہے ہمیں حال میں، جیسا بھی ہے یہ
کب دِن کو کیا کرتے ہیں شب کی باتیں!

سائنس اور امنِ عالم

(۱)

سائنس کو مغرب میں خُدا کہتے ہیں
جو کچھ بھی وہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں
اِن ٹینکوں سے جن کے اُڑے ہیں بازو
اُن سے بھی تو پُوچھو اِسے کیا کہتے ہیں!

(۲)

سائنس کی ترویج بہر طور کرو
تزئینِ بشر اور ابھی اور کرو
دُنیا کو جہنّم نہ بنا دے سائنس
لازم ہے کہ اِس بات پہ بھی غور کرو!

(۳)

صد حیف کہ انسان ہو آمادۂ جنگ
کیوں اس نے بنائے ہیں یہ توپ اور تفنگ
انسان اگر مائلِ تخریب رہا
ہو جائے گا دُنیا کا یہ گلشن بے رنگ!

(۴)

تہذیب کو برباد کئے جاتے ہیں
شیطان کی امداد کئے جاتے ہیں
دُنیا کی تباہی پہ تُلے ہیں جو لوگ
حربے نئے ایجاد کئے جاتے ہیں!

(۵)

نازاں ہے بشر کس لئے طیّاروں پر
مغرور ہے کیوں ایٹمی ہتھاروں پر
دھرتی پہ نہ کمبخت کو جینا آیا
پہنچی ہے نگاہِ پست سیّاروں پر

(۶)

یہ ٹینک، یہ توپیں ہیں، یہ بم، یہ راکٹ
کرتے ہو جمع کیوں یہ کوڑا کرکٹ
انسان کی تخریب کا سامان ہیں سب
پھینکو انہیں چاہِ تیرگی میں جھٹ پٹ

⑦

اُٹھتی ہے خلاف اس کے صدائے عالم
ہر وقت ہے خطرے میں بقائے عالم
ایٹم بم کے دھوئیں سے تاریک ہے عرش
مسموم ہے کس درجہ فضائے عالم!

⑧

لرزاں لرزاں ہے اِس سے نسلِ آدم
سہمی سہمی سی ہے فضائے عالم
کردے نہ کہیں محفلِ ہستی کو تباہ
شیطان کی ایجاد ہے یہ ایٹم بم!

⑨

ہیں کس لئے تخریب کے ساماں یہ بہم
انسان کو ہے کیوں پسند یہ ایٹم بم
سائنس سیاست کی نہ لونڈی بن جائے
مِٹ جائے گی ورنہ کبھی نسلِ آدم!

(۱۰)

یہ ٹینک، یہ بارُود، یہ توپ اور یہ بم
ہیں دشمنِ تہذیب، عدُوئے آدم
اللہ سے تو ہے بارشِ رحمت کی طلب
برساتے ہو خود آگ فضا میں پیہم!

(۱۱)

رکھے سائنس صرف تعمیر سے کام
بن جائے نشاط و عیش و راحت کا پیام
ہے یہ تو مری نظر میں اُس کی لونڈی
پھر کس لئے سائنس کا انساں ہے غلام[1]!

(۱۲)

سائنس کو الزام عبث دیتے ہو
شیطان کو دُشنام عبث دیتے ہو
درپردہ جو ہو مائلِ تیّاریِ جنگ[2]
پھر امن کا پیغام عبث دیتے ہو!

Science is a good servant but a bad master. [1]
[2] اسے فوجی اصطلاح میں Armed Peace کہتے ہیں۔

فکر و نظر

(۱)

اِس کشمکشِ زیست کا حاصل کیا ہے؟
حق کیا ہے، بتائے کوئی باطل کیا ہے؟
اے فلسفیو، دیدہ ورو! کچھ تو کہو
اِنسان کے اِس سفر کی منزل کیا ہے؟

(۲)

دُنیا ہے اگر خواب تو تعبیر ہے کیا؟
ہستی کے اِس افسانے کی تفسیر ہے کیا؟
رنج و غم و آلام کی اِس بستی میں
اوقات بسر کرنے کی تدبیر ہے کیا؟

(۳)

کرتی ہے ہمیں عقل اشارا کچھ اور
لیکن ہے طبیعت کا تقاضا کچھ اور
مجبور ہے کس درجہ زمانے میں بشر
کرتا ہے وہ کچھ، اور ارادا کچھ اور!

(۴)

انساں کی دوروزہ زندگانی کیا ہے؟
کیا چیز بُڑھاپا ہے، جوانی کیا ہے؟
جاتی ہے کہاں رُوحِ بشر بعدِ فنا
آنے جانے کی یہ کہانی کیا ہے؟

(۵)

کیا تُم سے کہوں کون ہوں کیسا ہوں مَیں
کس مُلک سے اِس دیس میں آیا ہوں مَیں
یہ راز ہے راز ہی ابھی تک اے دوست!
خُود اپنے لئے ایک معمّا ہوں مَیں!

(۶)

تُم جس کو سمجھتے ہو کہ آسُودہ ہے
دل اُس کا بھی دراصل غم آلُودہ ہے
مُمکن ہی نہیں، ہستیٔ فانی میں سُکوں
راحت کی طلب دہر میں بیہودہ ہے!

(۷)

جب دل میں کسی شخص کے غم ہوتا ہے
بانٹے سے نہ بٹتا ہے، نہ کم ہوتا ہے
زخموں کو ہرا اور بھی کرتے ہیں لوگ
پُرسش سے مزید یہ ستم ہوتا ہے!

(۸)

نالاں ہے غمِ دہر سے انسان بہت
اُٹھتے ہیں یمِ زیست میں طوفان بہت
اے دوست نظر اُلجھ کے رہ جائے نہ کیوں
افسانۂ ہستی کے ہیں عنوان بہت!

(۹)

زردار مئے عیش سے مخمور ہے کیوں
نادار ستم راندہ و مقہور ہے کیوں
دو خاک کے پُتلوں میں تفاوت اتنا
یارب تری دنیا میں یہ دستور ہے کیوں؟

(۱۰)

دھرتی تو فقط چھوٹی سی اِک بستی ہے
سوچو تو بشر کی اِس میں کیا ہستی ہے
اتنی سی بساط اور اس پر یہ غرور
پستی کے ساتھ ساتھ بدمستی ہے!

(۱۱)

دُنیا سے بہت دُور کہاں بیٹھے ہیں
بے بہرۂ فریاد و فغاں بیٹھے ہیں
ہے دہر میں ہنگامۂ محشر برپا
آرام سے اللہ میاں بیٹھے ہیں!

(۱۲)

تسکیں نہ مِلے جس سے وہ ایماں کیا ہے
بخشے نہ گناہ جو وہ یزداں کیا ہے
جو درد سے معمُور نہ ہو دل کیسا
اوروں کے نہ کام آئے جو انساں کیا ہے!

(۱۳)

وہ بات جو خلوت میں بھی کم کہتے ہیں
لو آج بھری بزم میں ہم کہتے ہیں
مذہب ہے فقط ذہنِ بشر کی تخلیق[۵]
دھوکے ہیں جنھیں دیر و حرم کہتے ہیں

(۱۴)

مانا کہ مَیں ہوں دیر و حرم سے بیزار
اخلاص و محبت ہے مگر میرا شعار
ناراض نہ ہوں شیخ و برہمن مُجھ سے
مَیں اپنی ضمیر کا ہوں فرماں بردار!

---

۵ جو مذہب دیر و حرم کے جھگڑوں اور باہمی تفریق کا باعث بن گیا۔ اصل مذہب انسانیت ہے۔ (بہسار)

فن اور فن کار

(۱)

کہتے ہیں جسے شعر مسیحائی ہے
جذبات کی ، افکار کی رعنائی ہے
جس سے نہ ہو آسودگیِ ذوقِ جمال
وہ شعر نہیں، قافیہ پیمائی ہے

(۲)

سوئی ہوئی قوموں کو جگا سکتا ہے
دُنیا کو نئی راہ دکھا سکتا ہے
آتا ہے دل جلوں کے لب پر جو شعر
پتّھر کو بھی وہ موم بنا سکتا ہے!

(۳)

درکار ہے دُنیا کو محبّت کا پیام
اربابِ سیاست کے خیالات ہیں خام
وابستہ ہے فردا کی تجھی سے اُمّید
اے شاعرِ امروز نہیں اِس میں کلام!

(۴)

تسکین کا سامان بہم کرتے ہیں
انسان کے دُکھ درد کو کم کرتے ہیں
اربابِ سیاست کے تو بس کا بھی نہیں
وہ کام جو ہم اہلِ قلم کرتے ہیں!

(۵)

برسوں دلِ فن کار میں غم پلتا ہے
جب شعر کے سانچے میں کہیں ڈھلتا ہے
معلوم رہے بن کے چراغِ محفل
فن کار کے سینے کا لہُو جلتا ہے!

(۶)

کیا تجھ کو خبر نہیں ہے فن کار ہیں ہم
عزّت نہیں بیچتے ہیں، خود دار ہیں ہم
بُغض و کینہ کی ہم سے باتیں کیوں ہیں
اخلاص و محبّت کے پرستار ہیں ہم!

(۷)

جتنے بھی ہیں یہ صاحبِ جاہ و ثروت
اِن کے لئے ہے دہر کی ہر اک نعمت
جو اہلِ ہنر، اہلِ نظر ہوتے ہیں
بڑھ کر انھیں خُلد سے ہے کُنجِ عُزلت!

(۸)

جو بھی تُمھیں فن کار نظر آئے گا
مُشکل میں گرفتار نظر آئے گا
رہتا ہے ہر انسان کے غم میں جو شریک
بے یار و مددگار نظر آئے گا

(۹)

رُلتا ہُوا مٹّی میں گُہر دیکھا ہے
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھا ہے
بے مہریِ دوراں کی بدولت ہم نے
فن کار کو بھی خاک بسر دیکھا ہے!

(۱۰)

وہ درد جو سینے میں نہاں ہوتا ہے
الفاظ میں کب ہم سے بیاں ہوتا ہے
اس درد کا لاکھ فکر[۱] کرنے پر بھی
اشعار میں اظہار کہاں ہوتا ہے!

(۱۱)

لازم ہے کہ تم میر کی توقیر کرو
لازم یہ نہیں پیرویِ میرؔ کرو
ہے فخر بجا اپنے بزرگوں پہ مگر
اپنا بھی کوئی مقام تعمیر کرو!

(۱۲)

معمارِ ادب لائق تادیب ہوئے
فن کار جو تھے مائلِ تخریب ہوئے
گندے جذبوں کی پرورش کرتے ہیں
سب اہلِ قلم دشمنِ تہذیب ہوئے!

---

[۱] مُراد فکرِ سخن

(۱۳)

اے شاعرو! خیر و شر کی تفریق کرو
حق جس میں ہو اُس بات کی تصدیق کرو
جو باعثِ بالیدگیٔ رُوح بنے
ایسا ادبِ عالیہ تخلیق کرو!

(۱۴)

بوسیدہ روایات کو توڑا ہم نے
فرسُودہ خیالات کو چھوڑا ہم نے
ماضی میں ادب تھا زندگی سے فرار
آخر اِسے زندگی سے جوڑا ہم نے!

(۱۵)

ٹکراتے ہیں جب ذہن سے جذباتِ لطیف
خُود سُوجھتے ہیں قافیہ و بحر و ردیف
جذبات کو شعروں کا پہناتا ہوں لباس
پڑھ کر جنہیں داد مجھ کو دیتے ہیں حریف

(۱۶)

مرغوب مجھے شغلِ مے و جام نہیں
منظورِ نظر ساقیِ گلفام نہیں
بیداریِ جمہور ہے مقصد میرا
رُوحوں کو سُلانے سے مجھے کام نہیں!

(۱۷)

جس دن سے ذرا ہوش سنبھالا میں نے
سینے میں غم و درد کو پالا میں نے
جس درد سے لبریز ہے جامِ ہستی
شعروں میں اُسی درد کو ڈھالا میں نے

(۱۸)

داتا نے مجھے سوزِ جگر بخشا ہے
نالوں میں قیامت کا اثر بخشا ہے
ہے قابلِ شکر دینے والے کی یہ دین
اظہارِ غمِ دل کا ہنر بخشا ہے!

(۱۹)

میں مصحفی و میر کا ثانی نہ سہی
محروم و فراق، اصغر و فانی نہ سہی
تصویر ہیں اِس عہد کی میرے اشعار
اِن میں وہ بلاغت، وہ روانی نہ سہی!

مُشاہدات

(۱)

اِس دہر کے پُرپیچ بہت رستے ہیں
یارانِ ریاکار یہاں بستے ہیں
گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے بشر
سانپوں کی طرح لوگ یہاں ڈستے ہیں!

(۲)

کچھ لوگ حقائق پہ نظر رکھتے ہیں
کچھ لوگ دقائق کی خبر رکھتے ہیں
لیکن ہیں کچھ ایسے بھی یہاں ننگِ وُجود
پہلو میں جو پتّھر کا جگر رکھتے ہیں

(۳)

پھرتے ہیں زمانے میں ہوس کار بہت
دیکھے ہیں محبّت کے خریدار بہت
رکھتے ہیں مرے دل کی جگہ جیب پہ آنکھ
سمجھے ہو جنھیں یار، ہیں عیّار بہت!

(۴)

منجدھار میں ناؤ یہ تِری چھوڑیں گے
مُشکل میں تجھے دیکھ کے مُنھ موڑیں گے
جی جان سے تُو جن کو سمجھتا ہے عزیز
اِک روز وہی تجھ پہ ستم توڑیں گے!

(۵)

سفّاک، ستم گار، ستم کوش ہیں یہ
مستِ مئے پندار ہیں، مدہوش ہیں یہ
کیا پُوچھتے ہو خود غرض انسانوں کا
کم ظرف ہیں، احسان فراموش ہیں یہ!

(۶)

آنکھوں میں حیا، دل میں مروّت ہی نہیں
حق کے لئے لڑ مریں یہ ہمّت ہی نہیں
اُف رے یہ ستم کوشیِ اربابِ غرض
غیرت نہیں، کچھ ان میں حمیّت ہی نہیں!

(۷)

تہذیب کے پُتلوں کی حقیقت دیکھی
اِن کے دل میں بھری کدُورت دیکھی
بیکار ہے اپنی تربیت پر انہیں ناز
دُور، اِن سے بہت دُور شرافت دیکھی

(۸)

ہم سے تو ہیں لاکھ درجہ اچھّے دہقان
اَن پڑھ ہونے پہ بھی ہیں بہتر انسان
بندے ہم کیشِ خود پرستی کے ہیں
ایثار کے مسلک پہ ہے اُن کا ایمان!

(۹)

سینوں میں کدُورت ہے، ریاکاری ہے
کچھ پاسِ مروّت ہے، نہ خُودداری ہے
ہم سے کیا پوچھتے ہو دُنیا کا چلن
ہر گام پہ سامانِ دل آزاری ہے!

(۱۰)

جھوٹوں ہی کی ہر جگہ پذیرائی ہے
سچّوں کی جہاں میں کہیں شنوائی ہے؟
دُشنام سُنے، سینے پہ کھائے پتّھر
سچ کہنے کی ہم نے یہ سزا پائی ہے!

(۱۱)

دل سب کے ہیں معمورِ جہالت دیکھو
اِن آئینوں میں گردِ کدورت دیکھو
دن رات محبّت کا جو دم بھرتے ہیں
اُن میں بھی بھری ہوئی ہے نفرت دیکھو!

(۱۲)

عادات سے حیوان نظر آتے ہیں
اطوار سے شیطان نظر آتے ہیں
کوئی جنہیں انسان نہیں کہہ سکتا
ایسے بھی کچھ انسان نظر آتے ہیں!

(۱۳)

دُنیا میں ہر اِک رنگ کے انساں دیکھے
اچھے کئی دیکھے، کئی شیطاں دیکھے
حیوان ہی ہوتے تو بڑی بات نہ تھی
حیوان سے بدتر بھی کچھ انساں دیکھے!

(۱۴)

کچھ درد ہی دل میں ہے، نہ آنکھوں میں حیا
سب اپنا یہاں کرتے ہیں اُلّو سیدھا
مطلب کے ہیں احباب و اقارب سارے
دُنیا کی روش دیکھ کے دِل ٹوٹ گیا!

(۱۵)

احباب کے اطوار بدل جاتے ہیں
اخلاق کے معیار بدل جاتے ہیں
"کُرسی" کا بھی نشّہ ہے وہ نشّہ جس سے
انسانوں کے کردار بدل جاتے ہیں!

(۱۶)

اُلفت کو حقارت میں بدلتے دیکھا
احباب کو احباب سے جلتے دیکھا
وہ لوگ جو ہوتے تھے کبھی شیر و شکر
آپس میں اُنھیں زہر اُگلتے دیکھا!

(۱۷)

بگڑی ہے کچھ اِس طور سے دُنیا کی ہوا
ہر شخص کے دل میں ہے نہاں مکر و ریا
یہ حال ہے صرف چند سکّوں کے لئے
بھائی بھائی کا کاٹ لیتا ہے گلا!

(۱۸)

کرتے ہیں یہ لیڈر بھی غضب کی باتیں
محفل میں ہیں ایّامِ طرب کی باتیں
کہتے ہیں کہ روشن ہے بہت مستقبل
دِل تھام کے ہم سُنتے ہیں سب کی باتیں!

(۱۹)

بُنیادِ صد آزار نظر آئیں گے
یہ بھیڑیئے خُونخوار نظر آئیں گے
ایمان کے، دھرم کے بظاہر پیرو
باطن میں سیہ کار نظر آئیں گے!

(۲۰)

ہندُو ہے کوئی اور مُسلماں کوئی
گیتا کوئی پڑھتا ہے تو قرآں کوئی
لیکن ہو جسے خلقِ خُدا سے اُلفت
مِلتا نہیں ایسا مجھے انساں کوئی!

(۲۱)

اب عِلم کی، کردار کی تکریم کہاں
اصحابِ ہُنرمند کی تعظیم کہاں
جو رُوح کے گوشوں کو منوّر کر دے
اِس نسل کی قسمت میں وہ تعلیم کہاں!

(۲۲)

دل جورِ مُسلسل کا نشانہ کیوں ہے
غمناک یہ ہستی کا فسانہ کیوں ہے
اخلاص و شرافت کا کہیں نام نہیں
محروم اِس جنس سے زمانہ کیوں ہے!

(۲۳)

دِل کُشتۂ صد رنج و محن کیسا ہے
لب پر گلۂ زاغ و زغن کیسا ہے
بُلبل کی نوا بارِ سماعت ہے جہاں
حیراں ہوں الٰہی یہ چمن کیسا ہے!

محسوسات و تجربات

(۱)

دم حُسنِ صداقت ہی کا بھرتا ہُوں مَیں
باطن کی صفائی ہی پہ مرتا ہوں مَیں
میرے قول و عمل میں کُچھ فرق نہیں
کہتا ہُوں وُہی بات جو کرتا ہُوں میں!

(۲)

حد درجہ ہے معصُوم طبیعت میری
حق گو ہُوں مَیں، حق گوئی ہے فطرت میری
جذبہ ہے یہ وہ جس سے مَیں رہتا ہوں غنی
اخلاص ہی اخلاص ہے دَولت میری!

(۳)

احباب پہ کرتا ہوں بھروسا اکثر
احباب مجھے دیتے ہیں دھوکا اکثر
جس کے لئے میں جان بھی کرتا تھا نثار
احسان فراموش وہ نکلا اکثر!

(۴)

جذبات کے سیلاب میں بہہ جاتا ہُوں
جو بات نہ کہنے کی ہو، کہہ جاتا ہُوں
کرتا ہے کوئی دوست جو مایُوس مجھے
مَیں اُس کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہُوں!

(۵)

جو دوست مِلے ہم کو وہ عیّار مِلے
غم خوار سب آمادۂ آزار مِلے
دُکھ درد ہمارا جو بٹائے آکر
ایسا بھی کوئی مونس و غم خوار مِلے!

(۶)

احباب شر انگیز و ہوس ناک مِلے
اِن سب کے گریبانِ وفا چاک مِلے
مَیں شاعرِ درویش وہ تیز و طرّار
ایسوں سے طبیعت مِری کیا خاک مِلے!

(۷)

اللہ نے حسّاس طبیعت بخشی
کھاتا ہوں میں ہر روز کوئی چوٹ نئی
کس کس سے بچاؤں دلِ نازک کو بہار
اِس آئینہ کے حریف پتّھر ہیں کئی!

(۸)

ہر جور و ستم کا مَیں سزاوار سہی
اپنے عصیاں کی ندامت پہ نگوں سار سہی
تھوڑی سی مروّت تو دکھائی ہوتی
مَیں آپ کی نظروں میں گنہگار سہی!

(۹)

غیرت کا تقاضا ہے کہ خاموش رہوں
اُفتاد پڑی ہے جو وہ خود ہی سہہ لوں
حالات سے مجبور ہوں لیکن مَیں آج
اے دوست اجازت ہو تو کچھ عرض کروں!

(۱۰)

مردانِ دل آزار سے جی ڈرتا ہے
یارانِ ریاکار سے جی ڈرتا ہے
محفوظ ہوں مَیں گوشۂ تنہائی میں
ہنگامۂ بازار سے جی ڈرتا ہے!

(۱۱)

آسائشِ دُنیا نہیں مطلوب مجھے
کب جاہ و زر و مال تھے محبوب مجھے
نفرت ہے مُجھے دہر کے ہنگاموں سے
تنہائیِ بے خلل ہے مرغوب مجھے!

(۱۲)

پھر آج طبیعت مِری گھبرائی ہے
پھر آج مِری جان پہ بن آئی ہے
پُرساں مِرے حال کا نہیں ہے کوئی
مَیں اور میرا گوشۂ تنہائی ہے!

(۱۳)

یہ رات، یہ آندھیاں، فضا یہ پُر نم
کیا پوچھتے ہو ایسے میں دل کا عالم
دم بھر میں یہ طوفان تو رُک جائے گا
طُوفاں مرے سینے میں بپا ہیں پیہم!

(۱۴)

سامان مُلاقات کا جب ہوتا ہے
کچھ آپ کا انداز عجب ہوتا ہے
رہتے ہیں خفا کِس لئے، کچھ تو کہیئے
ہر بات کا کوئی تو سبب ہوتا ہے

(۱۵)

کَوندے کی طرح مجُھ پہ لپکتے ہی رہو
شُعلے کی طرح مجُھ سے بھڑکتے ہی رہو
دِل میں کوئی ارمان نہ باقی رہ جائے
زخموں پہ نمک مرچ چھڑکتے ہی رہو!

(۱۶)

ہر روز یہ کیا آپ کِیا کرتے ہیں
دھمکی ہمیں بیکار دِیا کرتے ہیں
ہم آپ سے مرعُوب ہوں ممکن ہی نہیں
ہیں اور جو ڈر ڈر کے جیا کرتے ہیں!

(۱۷)

جو دل میں سزاؤں سے ڈرا کرتے ہیں
ہرگز نہیں ہم، اور ہُوا کرتے ہیں
مردانِ صفاکیش کو ڈر کس کا ہے
کہنا ہو جو بے خوف کہا کرتے ہیں!

(۱۸)

کیسے کہوں مردُود ہیں، ملعُون ہیں آپ
کج فہمی و پندار کی معجون ہیں آپ
بہکی بہکی سی کر رہے ہیں باتیں
آئے نہ سمجھ میں جو وہ مضمون ہیں آپ!

(۱۹)

پر ٹوٹ گئے، طاقتِ پرواز گئی
ایّامِ جوانی کی تگ و تاز گئی
ہر لحظہ مگر جبر و تشدّد کے خلاف
ممکن تھا جہاں تک مری آواز گئی!

(۲۰)

کیوں تُو نے عطا کی ہے مجھے طبعِ رواں
کِس واسطے بخشا ہے یہ اندازِ بیاں
رکھ دُوں سرِ طاق اُٹھا کے سارا یہ کلام
اُردو تو سمجھتا ہی نہیں کوئی یہاں!

(۲۱)

سرگرمیٔ بازار کے قابل نہ رہا
شیدائیِ ہنگامۂ محفل نہ رہا
آسُودۂ منزل ہیں ہوا تو کِس وقت
جب ولولۂ حصُولِ منزل نہ رہا!

(۲۲)

گُلشن سے بہاروں کا سلام آیا ہے
صحرا سے مسرّت کا پیام آیا ہے
جب بادہ کشی کا دل میں ارماں نہ رہا
اُس وقت مرے ہاتھ میں جام آیا ہے!

(۲۳)

مانا کہ غم و دردِ سراپا ہُوں مَیں
بے یار و مددگار ہوں تنہا ہُوں مَیں
آپ اِس کے لئے فکر ذرا بھی نہ کریں
جس حال میں ہُوں، جو بھی ہوں، جیسا ہُوں مَیں!

(۲۴)

دل میں کئی ارمان مچلتے ہی رہے
آرے سے کئی جگر پہ چلتے ہی رہے
مُنہ سے کبھی اِک حرف نکالا نہ بہار
ہم آتشِ خاموش میں جلتے ہی رہے!

(۲۵)

احباب کے الطاف و کرم دیکھ چکے
اغیار کے اندازِ ستم دیکھ چکے
حیرت ہے کہ زندہ ہیں ابھی تک کیونکر
کیا کیا نہ رہِ زیست میں ہم دیکھ چکے!

(۲۶)

حصّے میں مِرے دولتِ غم آئی ہے
آلام ہیں، افلاس ہے، تنہائی ہے
اِس پر بھی مَیں راضی بہ رضا رہتا ہوں
ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے!

(۲۷)

میں کُشتۂ آلام ہوں، پی لینے دو
جینے کی ہوس دل میں ہے، جی لینے دو
عُقبیٰ کی بھی فکر وقت پر کر لوں گا
دُنیا کا مُجھے لُطف ابھی لینے دو!

(۲۸)

اجباب نے کیا کیا ہمیں چکمے نہ دیئے
اغیار نے کیا کیا نہ ستم ہم پہ کیئے
وہ کون سی بجلی تھی جو ہم پر نہ گری
اِک ہم ہیں کہ ہر حال میں ہنس ہنس کے جیئے!

(۲۹)

اے بادہ کشو! بادہ پرستی کیا ہے
اِک رندِ بلا نوش کی ہستی کیا ہے
ہر حال میں ہم مست رہا کرتے ہیں
پی کر جو اُتر جائے وہ مستی کیا ہے!

(۳۰)

گرداب کی موجوں سے اُبھرنا سیکھیں
طوفاں سے مری طرح گزرنا سیکھیں
ہوتے ہیں جو طعنہ سنج مجھ پر احباب
پہلے وہ ذرا بات تو کرنا سیکھیں!

(۳۱)

نغموں سے جو لبریز ہے وہ ساز ہُوں مَیں
گُونجے گی جو کانوں میں وہ آواز ہُوں مَیں
یاروں نے مِری قدر نہ جانی لیکن
خُود اپنی نگاہوں میں سرافراز ہُوں مَیں!

یادیں

(۱)

ہر نقشِ حزیں دل سے مِٹا دیتا ہُوں
ہر تلخیٔ دوراں کو بھُلا دیتا ہُوں
ماحول سے جس وقت گھُٹن ہوتی ہے
گُزرے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہُوں!

(۲)

جب شوق تھا، ثروت تھی، توانائی تھی
دُنیا کی ہر اِک چیز میں رعنائی تھی
اب ایک تصوّر سا فقط باقی ہے
ہم پر بھی کسی روز بہار آئی تھی!

(۳)

اگلی سی طبیعت میں روانی نہ رہی
وہ دل، وہ دماغ، وہ جوانی نہ رہی
قسمت نے دو کپڑوں میں نکالا گھر سے[1]
ماضی کی کوئی پاس نشانی نہ رہی!

(۴)

جلوے ترے آنکھوں میں بسا لیتا ہوں
دُنیا نئی اِک اپنی بنا لیتا ہوں
کھاتا ہوں جو سینے پہ کوئی زخم نیا
مرہم تری یادوں کی لگا لیتا ہوں!

(۵)

اِک چوٹ جگر پہ پھر نئی کھائی ہے
پھر دل میں تری شکل اُتر آئی ہے
ماتھے پہ بھڑک اُٹھے ہیں یادوں کے چراغ
بجلی سی مرے ذہن میں لہرائی ہے!

---

[1] جب مُلک کا بٹوارہ ہوا۔

(۶)

سوئے ہوئے ارماں کو جگا دیتی ہے
جذبات کی آگ کو ہوا دیتی ہے
آتی ہے تری یاد جب اے جانِ بہار
ہر تارِ رگِ جاں کو ہلا دیتی ہے!

(۷)

یاد آتا ہے اکثر وہ کتابی چہرہ
وہ نرگسی آنکھیں، وہ گلابی چہرہ
ہر وقت مرے پیشِ نظر رہتا ہے
وہ کیف بھرا اُن کا شرابی چہرہ!

(۸)

یادوں کے حسین پھول چُنتے رہیئے
فردا کے حسین خواب بُنتے رہیئے
ہوتا رہے وقت کا تقاضا پُورا
اِمروز کی آواز بھی سُنتے رہیئے!

مناظرِ قدرت

(۱)

وہ صبح کی دیوی نے بجایا ہے ستار
ہر سمت ہے مُرغانِ سحر کی چہکار
اُوشا[1] نے بیہ چہرے سے اُٹھائی ہے نقاب
یا پھُوٹ پڑا ہے ایک سیلِ انوار

(۲)

وہ رنگِ شفق دیکھئے ہلکا ہلکا
جیسے مئے گُلرنگ کا ساغر چھلکا
خُورشید کا عکس یُوں نظر آتا ہے
جیسے کسی گُلفام کا آنچل ڈھلکا

---

[1] اُوشا سے مُراد صبح کی دیوی ہے جسے یُونانی دیومالا میں Aurora کہتے ہیں۔ (بہار)

(۳)

پچّھم سے وہ گھن گھور گھٹائیں اُٹھیں
کُہسار کے دامن سے ہوائیں اُٹھیں
ساون نے فضاؤں میں اُنڈیلی ہے شراب
پھر ساغر و مینا کی صدائیں اُٹھیں!

(۴)

پھر جھُوم کے اُٹھّے ہیں وہ کالے بادل
ساون ہے کہ کیف بارِ مے کی بوتل
پھر سبزۂ خوابیدہ نے انگڑائی لی
پھر سینۂ فطرت میں بپا ہے ہلچل!

(۵)

تھرکتی ہیں ساون کی فضائیں اے دوست!
چلتی ہیں طرب خیز ہوائیں اے دوست!
کروٹ لے لے کے جاگ اُٹھتا ہے نصیب
اُٹھتی ہیں وہ رُوح سے صدائیں اے دوست!

(۶)

چھلکا ہوا اِک جام لُنڈھا جاتا ہے
پیتے نہیں جو اُن کو پلا جاتا ہے
آتا ہے جو برسات میں گھِر کر بادل
آگ اور بھی کُچھ دِل میں لگا جاتا ہے!

(۷)

بادل ہے کہ اُڑتا ہوا میخانہ ہے
ندّی ہے کہ چھلکا ہوا پیمانہ ہے
ساون کی ہے یہ شام کہ ہے صبحِ ازل
کیا خُوب یہ فطرت کا پری خانہ ہے!

(۸)

پتّہ بھی کوئی شاخ پہ جب ہِلتا ہے
خوش ہوتا ہُوں مَیں، غنچۂ دل کِھلتا ہے
جو لُطف ہے قُدرت کے مناظر میں بہار
ہنگامۂ ہستی میں وہ کب مِلتا ہے!

دھرم سالہ

وادیٔ کانگڑہ کا خوبصورت صدر مقام جہاں مُصنّف نے
تین سال ملازمت کے سلسلے میں گزُارے

(۱)

ہنگامۂ بازار سے نفرت ہے مجھے
قدرت کے مناظر سے عقیدت ہے مجھے
آئی ہے فضا راس دھرم سالہ کی
اِس وادیٔ رنگیں سے محبّت ہے مجھے!

(۲)

ہر سمت یہ سرسبز درختوں کی قطار
آکاش کو چھُوتا ہوا وہ دھولا دار[1]
تا حدِ نظر پھیلے ہوئے دھان کے کھیت
یہ شہر دھرم سالہ ہے جنّت بہ کنار!

(۳)

یہ خطّۂ زرخیز بہت زیبا ہے
یہ حُسنِ دلآویز بہت زیبا ہے
دلکش ہے دھرم سالہ کا چپّہ چپّہ
یہ وادیٔ گُل ریز بہت زیبا ہے!

---

[1] The Dhauladhar Range کوہسار کا نام ہے۔

(۴)

کُہسار پہ وہ برف کے تودوں کی چمک
یہ دامنِ کُہسار میں ٹیسو کی مہک
رُومان ہی رُومان ہے بِکھرا ہر سُو
یہ چیل کے اشجار، یہ جھرنوں کی کھنک!

(۵)

کُہسار کے دامن سے ہوا آتی ہے
جھرنوں کے ترنّم کی صدا آتی ہے
چھا جاتا ہے اِک وجد کا عالم دل پر
آکاش پہ جس وقت گھٹا آتی ہے!

(۶)

وہ قُلّۂ کُہسار پہ کالے بادل
سرمست گھٹائیں، یہ ہوائیں چنچل
بھیڑوں کی یہ ڈاریں، یہ گڈریوں کا خروش
جھرنوں سے ٹپکتا ہوا یہ نرمل جل!

(۷)

تسکین کے ساماں نظر آئیں گے یہاں
کُہسار و خیاباں نظر آئیں گے یہاں
ہر گام پہ نظموں کے لئے اے شاعر
بِکھرے ہوئے عنواں نظر آئیں گے یہاں!

(۸)

بھیڑوں کو چَراتی ہے وہ اِک گدّی نار[۱۵]
ہر انگ سے رِستا ہے جوانی کا خُمار
کُہسار پہ بھیڑوں کو لئے جاتی ہے
آنچل میں چھُپائے ہوئے سینے کا اُبھار

(۹)

کُہسار پہ بھیڑوں کی وہ ڈاریں دیکھو
یہ چیل کے پیڑوں کی قطاریں دیکھو
آجائے گا راس دھرم سالہ آنا
قُدرت کی دلآویز بہاریں دیکھو!

---

[۱۵] اِس علاقے میں بسنے والے گدّی نسل کے لوگ پسماندہ ہونے کے باوجود بڑے خوشکیل ہیں۔ بالخصوص صنفِ نازک

(۱۰)

اِک بار دھرم سالہ جو آجاتا ہے
تا عُمر وہ اِس شہر کے گُن گاتا ہے
چشموں سے بجُھاتا ہے بڑے شوق سے پیاس
کُہسار کی پُر لُطف ہوا کھاتا ہے!

(۱۱)

یاد آئے گی ہر بات دھرم سالہ کی
رُومان بھری رات دھرم سالہ کی
بِکھرے ہوئے یہ برف کے تودے ہر سُو
پُر لُطف یہ برسات دھرم سالہ کی!

(۱۲)

کُچھ روز ابھی سیر یہاں کی کر لُوں
قُدرت کے خزانوں سے ہیں دامن بھر لُوں
جی میں ہے کہ جاؤں نہ دھرم سالہ سے[۱]
کیوں راحتِ دل چھوڑ کے دردِ سر لُوں!

---

[۱] پنجاب کی از سرِ نو تنظیم پر اس فقیر کو پہاڑ چھوڑ کر میدانی علاقے میں آنا پڑا۔ (بہارؔ)

جوانی

(۱)

سوئے ہوئے فِتنوں کو جگا دیتی ہے
اندازِ جنوں دل کو سِکھا دیتی ہے
آتی ہے جوانی جب اُڑاتی ہوئی ہوش
فرزانے کو دیوانہ بنا دیتی ہے!

(۲)

انسان کی تقدیر بنا دیتی ہے
بگڑی ہوئی تدبیر بنا دیتی ہے
تاثیر جوانی کی نہ مُجھ سے پُوچھو
یہ خاک کو اکسیر بنا دیتی ہے!

(۳)

دریائے محبّت میں روانی آجائے
موجوں میں ادائے نغمہ خوانی آجائے
پھر پھُوٹ پڑیں بربطِ دل سے نغمے
اے کاش پلٹ کے پھر جوانی آجائے!

حُسن و عشق

(۱)

رنج و غم و آلام کی باتیں چھوڑو
یہ تلخیٔ ایّام کی باتیں چھوڑو
کتنا طرب انگیز ہے آغاز اِس کا
تُم عشق کے انجام کی باتیں چھوڑو!

(۲)

جس دن سے مِرے سامنے تُو آئی ہے
میری نظر افلاک کو چھُو آئی ہے
دیکھا ہے اندھیرے میں اُجالا مَیں نے
کانٹوں سے مجُھے پھُول کی بُو آئی ہے!

(۳)

رہتا ہے دِل افسردہ و غمگیں اے دوست
مِلتی ہے تری یاد سے تسکیں اے دوست
بے کیف تھا افسانۂ ہستی میرا
اُلفت نے اِسے کر دیا رنگیں اے دوست!

(۴)

ہونٹوں پہ مُسلسل ترا افسانہ ہے
آنکھوں میں ترا جلوۂ مستانہ ہے
تھا روزِ ازل سے جو ترا شیدائی
اب تک ترا مُشتاق وہ دیوانہ ہے!

(۵)

آکاش پہ جس وقت گھٹا آتی ہے
کُہسار سے جس وقت ہوا آتی ہے
چھا جاتا ہے آنکھوں میں تصوّر تیرا
دل سے تری ہر وقت صدا آتی ہے!

(۶)

رہ رہ کے دلِ زار میں اُٹھتی ہے کَسک
مجھ سوختہ ساماں سے یہ دُوری کب تک
راتوں میں کہاں سے جگمگاہٹ آئے
اے ماہِ مبیں، ایک فقط ایک جھلک!

(۷)

اُٹھی ہے وہ مغرب سے گھٹا آجاؤ
کہتی ہے یہ ساون کی ہوا آجاؤ
بیتاب ہے دل، رُوح میں ہلچل ہے بپا
دم بھر کے لئے بہرِ خُدا آجاؤ!

(۸)

ہاتھوں میں مرے زُلفِ گرہ گیر تو دے
دیوانہ ہوں دیوانے کو زنجیر تو دے
پُوجا بخُدا اِس کی کروں گا ہر وقت
مُجھ کو تُو ایک اپنی تصویر تو دے!

(۹)

کہتے ہیں عبادت سے خُدا مِلتا ہے
ہو صدق بھی شامل تو صِلہ مِلتا ہے
ہم نے بھی کِسی بُت کی عبادت کی ہے
اب دیکھ رہے ہیں ہمیں کیا مِلتا ہے!

(۱۰)

شُعلہ مرے سینے میں بھڑک اُٹھا ہے
اِک جذبۂ خاموش پھڑک اُٹھا ہے
پھر آپ نے کیوں اُس کا فسانہ چھیڑا
میرا دلِ بیتاب دھڑک اُٹھا ہے!

(۱۱)

یاد اُس بُتِ کافر کی بھُلانا مُشکل
اپنا بھی ستمگر کو بنانا مُشکل
اُلجھن سی عجب دل میں رہا کرتی ہے
کھونا مُشکل ہے اُس کا پانا مشکل!

(۱۲)

اُس شوخ سے کب وصل کا ساماں ہوگا
دُشوار ہے یہ کام، کب آساں ہوگا
اِس آس پہ ہم اور کوئی دن جی لیں
کہہ دے مُنھ سے وہ بس کہ ہاں ہاں ہوگا!

(۱۳)

دل اُس بُتِ طنّاز کا دیوانہ ہے
جس کی ہر ایک آنکھ مے خانہ ہے
یہ تو ہے. بجا اُس سے محبّت ہے مجھے
باقی جو سُنا ہے وہ سب افسانہ ہے!

(۱۴)

اُن شوخ نگاہوں میں شرارت کیوں ہے
ہر ایک ادائے ناز آفت کیوں ہے
رَہ رَہ کے مجھے آتا ہے کیوں اُس کا خیال
اِس درجہ مجھے اُس سے محبّت کیوں ہے!

(۱۵)

اے دل تُجھے عشق کا یہ سودا کیوں ہے
زنجیرِ گلُو زُلفِ چلیپا کیوں ہے
کروٹ کسی پہلو کبھی لیتا ہی نہیں
آخر تُجھے اضطرابِ اِتنا کیوں ہے!

(۱۶)

سینے کا جو چاک ہے رفُو ہو جائے
ہے سرد جو، گرم وہ لہُو ہو جائے
دُنیا کی ہر آفت سے نمٹ لُوں خود ہی
مائل بہ کرم مُجھ پہ اگر تُو ہو جائے!

(۱۷)

دل دامِ محبّت میں ہُوا جب سے اسیر
رہتی ہے مرے سامنے تیری تصویر
دیکھا تھا جو اِک خواب تِری دید کے بعد
کیا جانیئے کب ملتی ہے اُس کی تعبیر!

(۱۸)

تسکین کا سامان ہو، راحت مِل جائے
رنج و غمِ ہستی سے فراغت مِل جائے
پڑ جائے اگر مجھ پہ تِری چشم کرم
بیمارِ غمِ عشق کو صحت مِل جائے!

(۱۹)

اِک لمحہ بھی حاصل تِری قُربت نہ ہوئی
کیوں میری طرف چشمِ عنایت نہ ہوئی
دن رات تِری یاد میں پُھنکتا ہُوں مَیں
اِک آگ ہوئی، تیری محبّت نہ ہوئی!

(۲۰)

دردِ دلِ بیمار کا درماں کردے
کیوں ہے یہ سکُوت مُنھ سے بس ہاں کردے
بارِ خاطر ہے گو کسی کا احساں
تُو آج مگر مجُھ پہ یہ احساں کردے!

(۲۱)

رنج و غمِ ہستی سے رہائی نہ ہوئی
مُمکن تِری محفل میں رسائی نہ ہوئی
جذبات نے طوفان اُٹھا رکھّا ہے
اِک قہر ہُوا، تیری جُدائی نہ ہوئی!

(۲۲)

خود آپ ہی نے عشق کا اظہار کیا
اِک جذبۂ خاموش کو بیدار کیا
اور اس پہ ہوئے جاتے ہیں خود مجھ سے دُور
یہ آپ نے کیا اے مری سرکار کیا!

(۲۳)

دو رُوحوں میں یہ فاصلہ کتنا ہے عجیب
کیوں راہ میں حائل ہے یہ جھُوٹی تہذیب
یُوں دُور سے کب تک ہمیں ترساؤ گے
آجاؤ ذرا اور، ذرا اور قریب!

(۲۴)

میں تجھ سے ہُوں اور مجھ سے تُو دُور بہت
آزُردہ ہُوں میں، تُو بھی ہے رنجُور بہت
رستے میں ہمارے ہیں کئی دیواریں
میری ہی طرح تُو بھی ہے مجبُور بہت!

(۲۵)

بہتر ہے کہ دُنیا سے بغاوت کر لُوں
اِس ڈھنگ سے دُور ہر مصیبت کر لُوں
جی چاہتا ہے توڑ کے اِک اِک زنجیر
دل کھول کے مَیں تجھ سے محبّت کر لُوں!

(۲۶)

ہم کوچۂ جاناں میں کئی بار گئے
سینے میں لئے حسرتِ دیدار گئے
دیدار مگر اپنے مقدّر میں کہاں
وہ جیت گئے، عِشق میں ہم ہار گئے!

(۲۷)

کب دیکھئے سامانِ طرب ہوتا ہے
دیدار میسّر تِرا کب ہوتا ہے
اِس کی باتوں سے کون باندھے اُمّید
دل کہتا ہے اب ہوتا ہے، اب ہوتا ہے!

(۲۸)

ہر حال میں اُلفت کا اثر ہوتا ہے
ہوتا نہیں محسُوس، مگر ہوتا ہے
چل جاتا ہے جب حُسن کا جادُو دل پر
معمورۂ دل زیر و زبر ہوتا ہے!

(۲۹)

کِتنا ہے دلآویز تبسّم تیرا
شہکار ہے قُدرت کا یہ رُوئے زیبا
گزرے ہیں نظر سے لاکھ مہ رُو لیکن
دیکھا نہیں حسین کوئی تجھ سا!

(۳۰)

اِدراک پہ بجلی سی گِرا دیتی ہے
توبہ کے گھروندے کو بھی ڈھا دیتی ہے
اُس چشمِ فسُوں گر کا فسُوں تو دیکھو
زاہد کو بھی دو گھُونٹ پِلا دیتی ہے!

(۳۱)

یہ رنگ، یہ رُوپ، یہ نزاکت، یہ لچک
آنکھیں جادُو بھری، یہ گالوں کی مہک
سر تا بہ قدم ایک قیامت کہیئے
ترشے ہوئے یہ ہونٹ، یہ دانتوں کی چمک!

(۳۲)

ڈُوبا ہوا رس میں وہ تکلّم ہے ہے
پُرکیف صدا میں وہ ترنّم ہے ہے
اُن مدھ بھری آنکھوں میں جوانی کا خُمار
ہونٹوں پہ وہ ہلکا سا تبسّم ہے ہے!

(۳۳)

اُس ماہ جبیں، ماہ لقا کے صدقے
اُس عشوہ گرِ ہوش رُبا کے صدقے
یہ ناز، یہ انداز، یہ چھب، یہ سج دھج
اُس شوخ کی ایک ایک ادا کے صدقے!

(۳۴)

افسانۂ زندگی ہے جتنا رنگیں
اُتنا ہی مرے دل کو بنا دے گا حزیں
اس درد کے درماں کی توقّع کیوں ہو
ممکن ہے کہیں عشق میں دل کی تسکیں!

(۳۵)

یہ تذکرۂ جورِ بُتاں کیا معنی!
یہ شکوۂ شیریں دہناں کیا معنی!
دل زہرہ جبینوں پہ چھڑکنے والو
یہ عشق میں فریاد و فغاں کیا معنی!

(۳۶)

ہم عشق کو ناکام نہ ہونے دیں گے
ہم حُسن کو بدنام نہ ہونے دیں گے
اُلفت میں دلِ زار پہ کیا کیا گزُری
یہ راز کبھی عام نہ ہونے دیں گے!

(۳۷)

بے لَوث ہے، بے لَوث محبّت میری
سرمایہ یہی ہے، یہی دولت میری
مَیں نام ترا شام و سحر لیتا ہُوں
اِس سے ہوتی ہے دُور کُلفت میری!

(۳۸)

تسکین کا ساماں ہے نظارا تیرا
کافی ہے فقط ایک اِشارا تیرا
رنج و غم و آلام نے گھیرا ہے مجھے
درکار ہے پھر آج سہارا تیرا!

(۳۹)

آیا ہُوں ترے پاس بڑی دیر کے بعد
دل کی ہے بُجھی پیاس بڑی دیر کے بعد
پھر آج مِلا پیامِ راحت مجھ کو
بر آئی مری آس بڑی دیر کے بعد!

(۴۰)

حق یہ ہے کہ ہم تجھ کو خدا سمجھے ہیں
سجدہ تری چوکھٹ پہ روا سمجھے ہیں
آدابِ محبّت سے ہمیں ہیں واقف
یہ اہلِ ہوس عشق کو کیا سمجھے ہیں!

(۴۱)

عشق اپنا عقیدت کے سِوا کچھ بھی نہیں
خاموش عبادت کے سِوا کچھ بھی نہیں
آیا ہے مری سمجھ میں بس یہ نکتہ
دُنیا میں محبّت کے سِوا کچھ بھی نہیں!

ردِّعمل

(۱)

کس طرح حدیثِ لب و رُخسار کہوں
کس مُنھ سے مَیں افسانۂ دِلدار کہوں
فاقوں سے مِرے اہلِ وطن مرتے ہیں
مَیں حُسن کی توصیف میں اشعار کہوں!

(۲)

عرفانِ محبّت کا سرُور اچّھا ہے
جو اپنی نظر میں ہے وہ نُور اچّھا ہے
دل زہرہ جبینوں کا نہیں ہے محتاج
شُعلہ خس و خاشاک سے دُور اچّھا ہے!

(۳)

اِس دَور میں بھی رسمِ جنُوں باقی ہے
حُسن اور محبّت کا فسُوں باقی ہے
ناپید ہوئے اور سب آثارِ قدیم
آخر رسمِ کُہن یہ کیوں باقی ہے!

(۴)

آپہنچا ہے اب ترکِ تعلّق کا مقام
اے حضرتِ دل آپ کو بس میرا اسلام
کیا کیا نہ مِری جان پہ صدمے گزُرے
مَیں مُفت ہوا عشق میں یارو بدنام!

(۵)

اِس عشق کا انجام بُرا ہوتا ہے
حالِ دلِ ناکام بُرا ہوتا ہے
ہو جاؤ گے بدنام زمانے بھر میں
بداچھا ہے، بدنام بُرا ہوتا ہے!

(۶)

جُز رنج و محن عشق میں کیا پاؤ گے
بیداد و ستم، جَور و جفا پاؤ گے
اے اہلِ نظر حُسن کے شیدا بن کر
تُم خود کو گرفتارِ بَلا پاؤ گے!

(۷)

صُورت یہ تری آہ بگڑ جائے گی
بستی یہ ترے دل کی اُجڑ جائے گی
ہو جائے گی دُنیا سے طبیعت بیزار
جب آنکھ کسی شوخ سے لڑ جائے گی!

(۸)

دن رات کا سُکھ چین گنوایا ہم نے
سب کچھ رہِ اُلفت میں لُٹایا ہم نے
خلوت میں کئی بار یہ سوچا ہے بہار
بیکار دل اُس بُت سے لگایا ہم نے!

(۹)

تسکین کی کوئی بھی نہ صُورت نکلی
ارماں نکلا، نہ ایک حسرت نکلی
جلتا ہوں لہُو کی آگ میں شب و روز
یہ عشق کی آنچ اِک مصیبت نکلی!

(۱۰)

یارو عجب اُلٹی مِری قسمت نکلی
اُلفت بھی مِرے حق میں مصیبت نکلی
تھا ناز بہت جس کی رفاقت پہ مُجھے
بیگانہ روش اُس کی محبّت نکلی!

(۱۱)

وعدہ جو کیا تُو نے وہ جھُوٹا ہی نہ ہو
یہ لُطف و کرم محض دکھاوا ہی نہ ہو
جو پیار چھلکتا ہے تِری آنکھوں سے
ڈر ہے مجُھے یہ بھی کہیں دھوکا ہی نہ ہو!

(۱۲)

ہر عشوۂ نازنیں ہے پیغامِ فنا
بھُولے سے بھی تُو دامِ محبّت میں نہ آ
آئی ہے قضا دَھر کے انوکھا اِک رُوپ
عورت[۱] کے ہر انداز میں ہے مکر و ریا!

---

[۱] صنفِ نازک کی شان میں گستاخی کرنے والا میں پہلا گنہگار تو نہیں۔ تاہم میرا نظریہ شوپنہار (Schopenhauer) کی طرح ایک مستقل فلسفہ کی حیثیت نہیں رکھتا۔ مذکورہ بالا چند رُباعیوں میں ایک گزرتا ہوا موڈ بیان کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عورت کو بطورِ عورت بُرا کہنا مقصود نہیں بلکہ عورت کے دامِ محبّت میں گرفتار ہونے کا عبرتناک انجام پیش کیا گیا ہے۔ (بہار)

(۱۳)

دِل اِس سے لگا کر نہ ہُوا شاد کوئی
ایسا نہ ملے گا سِتم ایجاد کوئی
جو آگ کو بھڑکائے وہ پانی ہے یہ
عورت ہے کہ مجموعۂ اضداد کوئی!

(۱۴)

کھا جائے جو انسان کو وہ ناگ ہے یہ
چُٹکی میں کرے بھسم جو وہ آگ ہے یہ
عورت پہ نہ بھُول کر بھی مائل ہونا
خواب آورِ مرگ جو ہے وہ راگ ہے یہ!

(۱۵)

کرتی ہے جب انسان کو تقدیر تباہ
لڑ جاتی ہے اُس کی کسی عورت سے نگاہ
شادی کر کے وہ نہیں کہیں کا رہتا
قانونِ مشیّت میں محبّت ہے گناہ!

نقوشِ یاس

(۱)

آتی ہے فضا غم کی مجھے راس کہاں
بے وجہ ہے مجھ سا ہدفِ یاس کہاں
نازک ہوں رگِ گُل سے بھی بڑھ کر ہیں بہار
لیکن دُنیا کو اِس کا احساس کہاں!

(۲)

اِک شعلۂ جاں سوز ہے پہلو میں نہاں
اِک آتشِ سیّال ہے رگ رگ میں رواں
ہیں سوزشِ پنہاں سے کہیں جل نہ مروں
ہر موجِ نفس اُٹھ کے نہ ہو جائے دُھواں!

(۳)

اِک آتشِ خاموش میں دن رات جلے
رنج و غم و آلام کے سائے میں پلے
بے طرح مصائب نے ہمیں گھیرا ہے
کب دیکھئے طوفانِ بلا سر سے ٹلے!

(۴)

کب رنج سے مجھ کو ہے فراغت حاصل
اِس حال میں جینا بھی ہُوا ہے مُشکل
ہر گام پہ درپیش نیا فِتنہ ہے
دُشمن تو ہزار اور تنہا مِرا دل!

(۵)

شعلہ سا شرر بار نظر آئے گا
دہکا سا دلِ زار نظر آئے گا
سینہ جو ہے سوزاں ابھی کچھ دیر کے بعد
اِک خاک کا انبار نظر آئے گا!

(۶)

جُز حسرتِ دیدار نہ کُچھ پاؤ گے
جُز آہِ شرر بار نہ کُچھ پاؤ گے
دیکھو جو کبھی جھانک کے میرے دل میں
تسکین کے آثار نہ کُچھ پاؤ گے!

(۷)

سینہ ہدفِ بیم و رِجا رہتا ہے
اِک فتنۂ حشر سا بپا رہتا ہے
رہتا ہوں اِدھر میں اپنے دل سے بیزار
دل میرا اُدھر مجھ سے خفا رہتا ہے!

(۸)

کیوں شام و سحر زخمِ دروں رِستے ہیں
آلام سے دِل اور جگر گھِستے ہیں
چکّی جس طرح پیستی ہے دانے
ہم گردشِ دوراں سے یونہی پِستے ہیں!

(۹)

رہتا ہے دلِ زار پریشاں کیا کیا
پلتے ہیں مِرے سینے میں ارمان کیا کیا
بخشا ہے مجھے یاس و غم و درد بہار
دُنیا کے مِرے سر پہ ہیں احساں کیا کیا!

(۱۰)

سر پر غم و آلام کا انبار رہا
کیا کیا نہ مصائب سے سروکار رہا
کیا پوچھتے ہو میری کہانی یارو
ماحول سے اِک عُمر میں بیزار رہا!

(۱۱)

جُگ بیت گئے کُلفتیں سہتے سہتے
غم کی رُوداد سب سے کہتے کہتے
یہ کون سے اعمال کا خمیازہ ہے
تنگ آ گئے اِس حال میں رہتے رہتے!

(۱۲)

ہے کتنی المناک کہانی میری
مُشکل سے کٹی ہستیٔ فانی میری
مُردوں سے بھی بدتر ہوں، مگر زندہ ہُوں
پیری سے بھی بدتر ہے جوانی میری!

(۱۳)

غم اِس کا نہیں کچھ، مجھے دولت نہ ملی
حاصل نہ ہوا عیش، مسرّت نہ ملی
ہاں اپنے مقدّر سے یہ شکوہ ہے ضرور
دو شعر بھی کہنے کی فراغت نہ ملی!

(۱۴)

بے مہریِٔ اوقات پہ ہنس دیتے ہیں
ناسازیِٔ حالات پہ ہنس دیتے ہیں
بیزار ہے دُنیا سے طبیعت اِتنی
ہر چیز پہ، ہر بات پہ ہنس دیتے ہیں!

(۱۵)

مَیں جلوۂ رُخسار کا سائل نہ ہُوا
رنگِ رُخِ محبُوب پہ مائل نہ ہُوا
تھا زخمیٔ شمشیرِ حوادث اِتنا
حُسنِ لبِ لعلیں کا بھی قائل نہ ہُوا!

(۱۶)

گیسوئے طرحدار کے خم بھُول گئے
ہر عشوہ و اندازِ صنم بھُول گئے
توڑی ہے کسی نے ہم پہ بیداد ایسی
گردوں کے بھی ہم جَور وستم بھُول گئے!

(۱۷)

رنج و غم و آلام کا ڈیرا ہی رہا
آفات و حوادث کا بسیرا ہی رہا
اُمّید کی اِس پر نہ پڑی ایک کرن
ماتم کدۂ دل میں اندھیرا ہی رہا!

(۱۸)

داغوں کی ہے بھرمار کہاں جاتے ہیں
خُوں بار یہ آثار کہاں جاتے ہیں
اک لمحہ بھی چھوڑ کر الٰہی مجھ کو
رنج و غم و آزار کہاں جاتے ہیں!

(۱۹)

مُمکن نہیں زخمِ دل ہو کافور ابھی
ہونے کا نہیں ختم یہ ناسُور ابھی
جب صُورتِ اندمال کچھ ہو پیدا
وُہ دِن ہے بہت دُور، بہت دُور ابھی!

(۲۰)

اِک رندِ سیہ کار کو پی لینے دو
راحت کے طلبگار کو پی لینے دو
ہستی کے مصائب سے پریشاں ہُوں بہت
مُجھ کُشتۂ آزار کو پی لینے دو!

(۲۱)

کیا تجُھ سے کہوں کس لئے پیتا ہُوں میں
سینے میں ہیں جتنے چاک سیتا ہُوں میں
الزام نہ دے بادہ کشی کا مجُھ کو
یہ دیکھ کہ کِس حال میں جِیتا ہُوں میں!

(۲۲)

کب بدلے گی یارب مِری تقدیر بتا
یا اِس کو بدل دینے کی تدبیر بتا
کیوں یورشِ آلام ہے مُجھ پر دِن رات
سرزد ہُوئی مُجھ سے کون تقصیر بتا!

(۲۳)

سہنے کو تو سو طرح کے غم سہتے ہیں
اِک بات مگر ادب سے ہم کہتے ہیں
زیبا نہیں غم زدوں سے تُجھ کو یہ سلُوک
مانا تجھے سب لوگ خُدا کہتے ہیں!

(۲۴)

یہ عالمِ امکاں ہے کہ دھوکا ہے کوئی
یہ گردشِ دَوراں ہے کہ دھوکا ہے کوئی
دُنیا کے ستم سہہ کے خیال آتا ہے
ہستی کا یہ ساماں ہے کہ دھوکا ہے کوئی!

(۲۵)

پژمُردہ و افسُردہ ہر انساں دیکھا
ہر شخص غم و رنج سے نالاں دیکھا
اِک مَیں ہی نہیں شاکیٔ غمہائے زماں
دُنیا میں جسے دیکھا پریشاں دیکھا!

(۲۶)

جانچا ہم نے بہت نظامِ عالم
ہر چیز نظر آتی ہے درہم برہم
کِس کِس ستم و جَور کا رونا روئیں
غم ایک اگر ہو تو کریں اُس کا غم!

مُلک و مِلّت

(۱)

ہے پست بہت اہلِ وطن کا کردار
گرتا ہی چلا جاتا ہے اِن کا معیّار
باتیں تو بناتے ہیں بہت ہم لیکن
اِک کام بھی کرنے کو نہیں ہیں تیّار!

(۲)

فقدان عمل کا ہے تو عنقا کردار
صد حیف کہ ہیں ذہن ہمارے بیمار
ہے کام سے ہم لوگوں کو نفرت لیکن
دھینگا مُشتی ہی اب ہمارا ہے شِعار!

(۳)

کچھ اور ہے اب گردشِ دوراں کا مزاج
آ پہنچی ہے تہذیب نئے موڑ پہ آج
ہم پر ہے سوار اب بھی روایات کا بھُوت
کھا جائیں گے اِس ملک کو فرسُودہ رواج!

(۴)

جو قوم سمجھتی ہے زمانے کا مزاج
بن جاتی ہے اقوامِ جہاں کی سرتاج
ہم کُہنہ روایات کے اب بھی ہیں اسیر
فرسُودہ ہے فرسُودہ ہمارا یہ سماج!

(۵)

اِس مُلک میں رشوت کی یہ لعنت کیوں ہے
حبُّ الوطنی مالِ تجارت کیوں ہے
اربابِ سیاست نے یہ سوچا بھی کبھی
ہر شخص کے ہونٹوں پہ شکایت کیوں ہے!

(۶)

بازار کی ہر چیز میں آمیزش ہے
گھی، دُودھ، نمک، آٹے میں آلائش ہے
پھر اِس پہ کمر توڑ گرانی توبہ
جینے کی کہاں اب کوئی گُنجائش ہے!

(۷)

جمہور زبوں حال ہوئے جاتے ہیں
غم خوردہ و پامال ہوئے جاتے ہیں
نرخوں کے اضافے کا یہ عالم ہے کہ اب
خوش حال بھی کنگال ہوئے جاتے ہیں!

(۸)

جو چیز ہے نایاب ہوئی جاتی ہے
بھولا ہوا اِک خواب ہوئی جاتی ہے
جنتا کی جو حالت ہے وہ ناگفتہ بہ
اِک ماہیٔ بے آب ہوئی جاتی ہے!

(۹)

کیوں مُلک میں ادبار ہے، ناداری ہے
بیماری و بیکاری و بیزاری ہے
غیروں کی غلامی سے تو آزاد ہوئے
اپنوں کی مگر مشقِ ستم جاری ہے!

(۱۰)

یہ کینہ، یہ سازشیں، یہ پندار، یہ جھوٹ
یہ بَیر، یہ تفرقے، فسادات، یہ پھُوٹ
کیا جانیئے کب تک رہے یہ صُورتِ حال
اِس مُلک میں ہو رہی ہے کیا لُوٹ کھسُوٹ!

(۱۱)

افسُردگی و غم کی گھٹا طاری ہے
ماحول سے ہر ذہن میں بیزاری ہے
کردار کا فقدان، عمل سے نفرت
اِس مُلک کی اِک عظیم بیماری ہے!

(۱۲)

چہرے سے وُہی یاس عیاں ہے کہ جو تھی
ہونٹوں پہ وُہی آہ و فغاں ہے کہ جو تھی
کہتے ہیں تونگر کے گھر آئی ہے بہار
مُفلس کے گھروندے میں خزاں ہے کہ جو تھی!

(۱۳)

غفلت اچھی نہیں ہے، بیدار رہو
مُشکل کے مقابلے کو تیّار رہو
پھرتے ہیں جو آپس میں لڑانے والے
اِن فرقہ پرستوں سے خبردار رہو!

(۱۴)

شاید ہے تِرا ذوقِ نظر خام ابھی
ہے ساقی و مینا سے تجھے کام ابھی
للکارا ہے دُشمن نے تِری غیرت کو
ہاتھوں میں لئے بیٹھا ہے تُو جام ابھی!

(۱۵)

پھر آج کسی نے مجھے للکارا ہے
پھر پیٹھ میں بزدل نے چھُرا مارا ہے
مُنہ توڑ جواب مجھ کو دینا ہے اُسے
ایسوں کی شرارت کا یہی چارا ہے!

(۱۶)

ہم آشتی و امن کے شیدائی ہیں
ہر اک سے رفاقت کے تمنّائی ہیں
اِس پر بھی وُہی اُلجھ رہے ہیں، ہم سے
کل تک جو یہ کہتے تھے کہ ہم بھائی ہیں!

(۱۷)

آزادیٔ افکار جو کھو دیتی ہے
بیباکیٔ کردار جو کھو دیتی ہے
دھنس جاتی ہے ذلّت کے گڑھے میں وہ قوم
سرمایۂ اقدار جو کھو دیتی ہے!

(۱۸)

سائنس کے اسرارِ نہاں عام کرو
دُنیا میں بُلند دیش کا نام کرو
ہے عالمِ بالا سے یہ نہرو کی پُکار
چھوڑو باتیں فضول، کُچھ کام کرو!

(۱۹)

آئینۂ ایّام میں تابندہ ہیں
تاریخ کے صفحات میں پائندہ ہیں
مرتے ہیں جو ناموسِ وطن کی خاطر
وہ لوگ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں!

(۲۰)

گو جیب میں پیسہ نہیں، نادار ہوں مَیں
اِس مُلک کے حالات سے بیزار ہوں مَیں
اِس پر بھی مُجھے اُنس ہے اِس دھرتی سے
دیوی ہے یہ وہ جس کا پرستار ہوں مَیں!

شعارِ اُمّید

(۱)

یہ آہ و فغاں ، گریۂ پیہم کب تک
یہ نالہ و فریاد کا عالم کب تک
کِس چیز کو دُنیا میں میسّر ہے ثبات
آخر دلِ مرحُوم کا ماتم کب تک!

(۲)

ویراں ہے دلِ زار تو ویراں ہی سہی
ہستی کے مصائب سے پریشاں ہی سہی
ہر بے کس و مظلُوم کو ڈھارس دیں گے
ہم دَہر کے رَوندے ہوئے اِنساں ہی سہی!

(۳)

طُوفان جو سر پر ہے وہ ٹل جائے گا
یہ وقت مصیبت کا نکل جائے گا
چھایا ہے گھٹا ٹوپ اندھیرا لیکن
یہ جلد اُجالے میں بدل جائے گا!

(۴)

آئی سُورج کا لے کے پیغام کِرن
ہے غرق تجلّیوں کے ساگر میں گگن
اے مُنتظرِ صُبحِ وطن آس نہ چھوڑ
ہو گا تیرا بھی خانۂ دل روشن!

(۵)

رنج و غم آلام کے بادل چھٹ جائیں
اس دیش کے باسیوں کے سنکٹ کٹ جائیں
چڑیا سونے کی پھر یہ بھارت بن جائے
سب لوگ اگر فرض پہ اپنے ڈٹ جائیں!

(٦)

تاریک گھروندوں میں اُجالا ہو جائے
ماضی کی خطاؤں کا ازالہ ہو جائے
اُٹھیں جو گِرے ہوئے ہیں اب تک
پستی سے نِکل کے بول بالا ہو جائے!

(٧)

بگڑی ہوئی تقدیر بنا سکتے ہیں
کھوئی ہوئی توقیر کو پا سکتے ہیں
آپس کے نزاع کو جو کر دیں ہم ختم
پھر فخر سے سر اپنا اُٹھا سکتے ہیں!

(٨)

سُورج نکلا، سحر ہوئی، رات گئی
رنج و غم و آلام کی بارات گئی
صد شُکر نہیں غیر کے اب ہم محتاج
دل شاد ہوئے، تلخیٔ اوقات گئی!

طنز و مزاح

(۱)

شاعر

یہ شاعر بدحال بھی کیا جیتے ہیں
دن رات غمِ قوم میں رَم پیتے ہیں
اِن کے دل کا تو ہے گریباں صد چاک
اوروں کے گریبان مگر سیتے ہیں!

(۲)

ڈاکٹر

ہے ڈاکٹر اِس دُھن میں کہ بن جائے رئیس
پہلے سولہ تھی فیس، اب ہے بتّیس
اِک قصّۂ پارینہ ہُوا خدمتِ خلق
مرجائے مریض اس کو مگر چاہیئے فیس!

(۳)

وکیل

ہر کیس میں گھڑ لیتا ہے یہ کوئی دلیل
قاتل کے لئے نکال لیتا ہے سبیل
معصوم کو پھانسی کی سزا دِلوادے
روٹی تو کسی طرح کما کھائے وکیل!

(۴)

اُستاد

اُستاد ہیں عنقا جو ہوں مہر و اشفاق
کیا اُس سے دُرست ہو کسی کا اخلاق
طُلباء کی تربیت کریں گے کیا خاک
یہ لوگ تو ہیں خُود ہی بڑے پست مذاق!

(۵)

طالبِ علم

جو کام نہ کرنا ہو کِیا کرتے ہیں
سگرٹ، وہسکی ہی بس پِیا کرتے ہیں
آوارہ پھرا کرتے ہیں اب طالبِ علم
گُل قوم کا اِس طرح دِیا کرتے ہیں!

(۶)

کالج

کب کام کی ہوتی ہے کوئی بات یہاں
چلتا ہے فقط دَورِ خرافات یہاں
کالج میں رہا کرتی ہے ہُلّڑ بازی
لڑکوں کی بگڑ جاتی ہیں عادات یہاں!

(۷)

ہوسٹل

دیکھیں گے عجب آپ روایات یہاں
اُلٹی ہی نظر آئے گی ہر بات یہاں
جو طالبِ علم ہے وہ کرتا ہے مزے
کرتا ہے بسر عیش سے دِن رات یہاں!

(۸)

ایوننگ کالج[1]

لگتی ہے یہاں عشق کی ہر شام کلاس
بے طرح یہاں ہوتا ہے تہذیب کا ناس
ٹھیکے کے ملازم ہیں یہاں پروفیسر
شاگرد کو ٹھیکے پہ کراتے ہیں پاس!

---

[1] اُن پرائیویٹ Coaching Academies کی طرف اشارا ہے جن کی مہربانی سے اعلیٰ تعلیم کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے!

(۹)

سائنس داں

جتنے بھی یہ تجربے ہیں سب ہیں بے سُود
ہے اِن کا اثر لیبارٹری تک محدُود
وہ علمِ طبیعی کسی مَصرف کا نہیں
بہبُودیٔ انساں نہ ہو جس کا مقصُود!

(۱۰)

ریسرچ اسکالر

دن رات ہیں سُلجھاتا ہُوں اسرارِ دقیق
ہے بال کی کھال اُتارنے کی توفیق
انڈا پہلے بنا کہ مرغی اے دوست!
برسوں سے میں کر رہا ہُوں اِس پر تحقیق!

(۱۱)

قوم کا معمار

کنگال ہُوں، قلّاش ہوں، نادار ہُوں مَیں
افسُردہ و پژمُردہ و ناچار ہُوں مَیں
تنخواہ قلیل اِتنی کہ روٹی نہ مِلے
کہنے کو مگر قوم کا معمار ہُوں مَیں!

(۱۲)

بور

اک دوست ہمارے ہیں بہت نامعقول
جو بات بھی کرتے ہیں وہ ہوتی ہے فضول
ہر وقت ہمیں بور کیا کرتے ہیں
بَکتے ہی چلے جاتے ہیں کُچھ اُول جلُول!

(۱۳)

افسانہ نویس

گو جنس کے جذبے کی فراوانی ہے
افسانوں کے ہر لفظ میں عُریانی ہے
بکتے رہتے ہیں پھر بھی ناول میرے
دُنیا نے مری قدر تو پہچانی ہے!

(۱۴)

غزل سرا

اِس عہد میں جو لوگ غزل کہتے ہیں
ہے اُن کے دماغوں میں خلل کہتے ہیں
ساقی و مے و جام کے قصّے یہ لوگ
کیا کیا بے موقع و محل کہتے ہیں!

(۱۵)

قدامت پرست اُستاد

واللہ یہ کیا خُوب غزل تُم نے کہی
نے صنعتِ تعلیل، نہ حُسنِ لفظی
اِس شعر میں تعقید، تنافر اُس میں
یہ پہلوئے ذم اور وہ اِیطائے جلی!

(۱۶)

جدیدیت پسند شاعر

اُستاد مِرا ہے نہ کوئی میرا مُرید
منظور نہیں مجُھ کو کسی کی تقلید
پابندیٔ بحر کا نہیں مَیں قائل
تُم لوگ سمجھتے ہیں مِری نظمِ جدید!

(۱۷)

اُپدیشک

تہذیب و ثقافت کے نگہباں ہیں یہ
اخلاق و تقدّس کے ثنا خواں ہیں یہ
اَوروں کو تو اُپدیش دیا کرتے ہیں
خُود جاہل و بے بہرہ ہیں، ناداں ہیں یہ!

(۱۸)

پُجاری

مندر میں وہ بیٹھا ہے پُجاری دیکھو
کیفیتِ وجد اس پہ ہے طاری دیکھو
سِکّوں کے وہ انبار لگے جاتے ہیں
ہوتی ہے یہاں رحمتِ باری دیکھو!

(۱۹)

جیوتشی

سُنتے ہیں کہ تُو ہے ماہرِ علمِ نجُوم
ہے سارے محلّے میں ترے علم کی دُھوم
مُجھ کو بھی ذرا اس کا چمتکار دکھا
لے پانچ روپے میرا بدل دے مقسُوم!

(۲۰)

فلم اسٹار

ہر شخص کے دل کو کر رہے ہیں مسحُور
نرگس ہو ثریّا ہو کہ ہو راج کپور
یہ فلم اسٹار جس قدر ہیں نامی
اتنا تو نہ تھا شیکسپیئر بھی مشہُور!

(۲۱)

ایکٹر

کیا پائے گا اسکول کا ٹیچر بن کر
بنتا اگر ایکٹر تو ہوتا بہتر
ملتی تھی تجھے لکھ پتی کی بیوی اے کاش
نظریں پڑتیں ہزارہا کی تجھ پر!

(۲۲)

ایکٹریس

ہر شخص کے لب پر ہے کہانی تیری
ہے جیب میں محفوظ نشانی تیری
کیا سحر ہے کافر تری اِن آنکھوں میں
کیا چیز ہے ظالم یہ جوانی تیری!

(۲۳)

نرس

یہ جذبۂ ایثار ترا ہے کیا چیز
بیگانے یگانے میں نہیں کوئی تمیز
اے نرس تجھے کیوں نہ مسیحا کہہ دوں
تُو زہر جو دے تو وہ بھی مجھ کو ہے عزیز!

(۲۴)

مریضِ عشق

بیمار کو ہر روز پلاتی تھی دوا
اے نرس اسے آنکھ سے تُو آج پلا
تھا دردِ جگر میں جو گرفتار کبھی
اب تیری محبّت میں گرفتار ہُوا!

(۲۵)

شادی

بھولے سے بھی ہو جائے گا جس شخص کا بیاہ
شیطان بھی اُس کو نہ کہیں دے گا پناہ
کر دیتا ہے بیوی کا ستم ناک میں دم
مُشکل ہے بہت مرد کا عورت سے نِباہ!

(۲۶)

لاٹری کا ٹکٹ

اِک لاٹری کا مَیں نے خریدا ہے ٹکٹ
خواہش ہے کہ بن جاؤں تونگر جھٹ پٹ
اب خواب میں بھی نوٹ گِنا کرتا ہُوں
مِلتا نہیں آرام کِسی بھی کروٹ!

(۲۷)

تاش

کُچھ لوگوں کی ہے تاش سے تحصیلِ معاش
یہ جانتے ہیں رُمی، برج اور فلاش
اِتوار کے دن پر ہی یہ موقوف نہیں
ہر شام کو اُڑتا ہے بِلا ناغہ تاش!

(۲۸)

کلب

کُچھ لوگ جِنھیں اور نہیں کوئی بھی کام
جاتے ہیں بِلا ناغہ کلب میں ہر شام
چلتی ہے وہاں بارہ بجے تک رُمی
لُنڈھے ہیں یہاں رات ڈھلے جام پہ جام!

(۲۹)

سوداگر

یہ کون ہیں، اِس مُلک کے سوداگر ہیں
ماتحت اِنہیں کے یہ تمام افسر ہیں
بے خوف و خطر کرتے ہیں دن رات بلیک
بے درد ہیں، سنگدل ہیں، اِک پتّھر ہیں!

(۳۰)

حاکم

اِس شہر کے جتنے بھی ہیں اعلیٰ حُکّام
کرتا ہے اِنہیں دُور سے ہر شخص سلام
اَوروں پہ تو کرتے ہیں حکومت یہ لوگ
لیکن ہیں خُود اپنی ہی خباثت کے غُلام!

(۳۱)

مِلٹری افسر

کُچھ کام کریں یا نہ کریں ، نام مِلے
دن رات یہی دُھن ہے کہ اِنعام مِلے
دُشمن سے بھلا جنگ میں رکھّا کیا ہے
وِہسکی کا ہمیں جام پہ بس جام مِلے!

(۳۲)

سیاسی لیڈر

ہے فیل تو کیا فکر ہے اے جانِ پدر
بن جائے گا تُو جلد سیاسی لیڈر
پہنائیں گے لوگ ہار پھُولوں کے تجھے
ناچیں گے ترے حُکم پہ اعلےٰ افسر!

(۳۳)

وزیر

محفل میں بڑی شان سے آئے ہیں وزیر
پتّھر برسائے گی ابھی اِک تقریر
کیا خاک کریں گے قوم کو یہ بیدار
سویا ہُوا رہتا ہے جب اُن کا ہی ضمیر!

(۳۴)

گورنر

کابینہ اگر جسم ہے تو سر ہوں مَیں
کیسا تقدیر کا سکندر ہوں مَیں
اِمسال الیکشن میں مِری ہار ہوئی
پہلے تھا وزیر، اَب گورنر ہوں مَیں!

(۳۵)

اِبنُ الوقتؔ[1]

جن سنگھ کے ووٹوں سے الیکشن جیتا
ممبر ہُوں مگر اب ہیں اکالی دل کا
کُچھ بھی ہو منسٹر مجھے بننا ہے ضرور
ہر چال ہے میدانِ سیاست میں روا!

---

[1] ہمارے ملک کی سیاست پر سب سے بدنما داغ Defectionists ہیں جو مصلحت دیکھ کر مختلف سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اپنی وفاداری بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں کسی خاص سیاسی پارٹی کی طرف اشارہ نہیں۔ ضرورتِ شعری کے مطابق ایک دو پارٹیوں کا نام لیا گیا ہے۔ مگر اِن کی جگہ کسی بھی دوسری سیاسی پارٹی کا نام بدلا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ بیماری کسی ایک پارٹی تک محدود نہیں۔ (بہارؔ)

تسخیر قمر

(۱)

اب چاند پہ انساں نے پھینکی ہے کمند
دیکھے تو کوئی اِس کا ذرا عزمِ بلند
پٹکا فرشِ زمیں پہ جس آدم کو
پھر عرش نشیں ہے وہ خُدا کا فرزند!

(۲)

کیا کیا نہ کئے معرکے انسان نے سر
اجرامِ فلک کی بھی یہ لایا ہے خبر
ہے چاند کی سَیر کارنامہ اِس کا
لو چرخ کو بھی چیر گئی اِس کی نظر!

(۳)

باقی مہ و خُورشید کی دُوری نہ رہی
کُچھ رفعتِ افلاک ضروری نہ رہی
بیتاب تھا کونَین پہ چھا جانے کو
انساں کی یہ خواہش بھی ادھُوری نہ رہی!

(۴)

اِس دَور کے انسان خلا[۱] تک پہنچے
دیکھے تو کوئی کِس انتہا تک پہنچے
کب طاقتِ پرواز کی اب ہو تکمیل
کب دیکھئے انسان خُدا تک پہنچے!

(۵)

اللہ رے یہ عظمتِ ابنِ آدم
اِک خاک کے پُتلے میں ہے اِتنا دم خم
بھر لی زنبیل ریزہ ہائے مہ[۲] سے
لہرا دیا آسماں پہ اپنا پرچم!

(۶)

ہے چاند کی سطح پر پھریرا اپنا
ڈالا ہے فلک پہ جا کے ڈیرا اپنا
ہم سے دہشت زدہ ہوئے ہیں انجم
گِردِ مہ و خُورشید ہے گھیرا اپنا!

---

[۱] جہاں ارضی دباؤ ختم ہو جاتا ہے۔
[۲] ہوا باز چاند کی چٹانوں کے ریزے ساتھ لے آئے تھے۔

(۷)

اِک خاک کے پُتلے نے غضب ڈھایا ہے
آکاش سے دھرتی پہ خبر لایا ہے
یہ عزم، یہ پرواز، یہ جذبہ، یہ جنُوں
انسان کے حصّے میں فقط آیا ہے!

(۸)

پہلوئے بشر میں دلِ دیوانہ ہے
آمادۂ صد جرأتِ رندانہ ہے
افلاک پہ اِک خاک کا پُتلا پہنچا
یارو یہ حقیقت ہے کہ افسانہ ہے!

(۹)

انساں کی طلسم ساز ہستی دیکھو
گردوں پہ بسا رہا ہے بستی دیکھو
ساتھ اِس کے زمیں پہ ہے یہ کتنا پامال
اِس اَوج کے ہوتے بھی ہے پستی دیکھو!

(۱۰)

آباد ہوا چاند پہ دھرتی کا مکیں
ہر سمت سے اُٹھی ہے صدائے تحسیں
ڈرتا ہوں کہ دھرتی کو اُجاڑا جس نے
کردے اب چاند کو نہ تاراج کہیں!

(۱۱)

انسان کا اپنا جو ہے کردار سیاہ
اس سے کہیں چاند بھی نہ ہو جائے تباہ
دھرتی ہی پہ تھا چین سے رہنا دشوار
اب دیکھیے افلاک پہ کیونکر ہو نباہ!

(۱۲)

یہ چاند پہ جانا کوئی سازش تو نہیں
تحقیق کے پاؤں میں یہ لغزش تو نہیں
دھرتی پہ جن اعمال سے رُسوا ہے بشر
کیا اُن کو چھپانے کی یہ کوشش تو نہیں!

(۱۳)

پرچم جو بشر چاند پہ لہرائے گا
پہنائیٔ افلاک پہ چھا جائے گا
کردار کی پستی پہ جو ڈالے گا نظر
پھر اِتنی بلندی پہ بھی شرمائے گا!

(۱۴)

افلاک کو چھُو آیا ہے انساں کوئی
کُچھ دیر رہا چاند کا مہماں کوئی
اب ماہ جبیں ہم نہ کہیں گے تُجھ کو
سوچیں گے تِرا اور ہی عنواں کوئی!

(۱۵)

چہرے سے حزیں، رنگ میں پیلا نکلا
کب تیری طرح چھَیل چھبیلا نکلا
جس چاند سے تشبیہ مَیں دیتا تھا تُجھے
مٹّی کا وہ صرف ایک ٹِیلا نکلا!

اُردو

(۱)

اِک جہل کے سیلاب میں جو بہتے ہیں
اِک عالمِ موہُوم میں جو رہتے ہیں
کم ظرف و کم اندیش ہیں، کج فہم ہیں جو
دن رات وہ اُردو کو بُرا کہتے ہیں!

(۲)

نادان ہیں اُردو کو مٹانے والے
لوگوں کو زبانوں پہ لڑانے والے
جو ورثۂ اجداد کو ٹھکراتے ہیں
لعنت اُنھیں بھیجیں گے زمانے والے!

(۳)

ہندی سے مجھے پیار ہے، ہاں اپنی ہے
یہ ماتری بھاشا ہے، یہ ماں اپنی ہے
اُردو سے تجھے بیَر یہ ناحق کیسا
اَے تنگ نظر، یہ بھی زباں اپنی ہے!

(۴)

بھارت میں نہیں ہے تو کہاں ہے اُردو
کیا مصر کی، ٹرکی کی زباں ہے اُردو
بھارت میں یہ پیدا ہوئی، پروان چڑھی
آپس کے ملاپ کا نشاں ہے اُردو!

(۵)

کِس درجہ ہے شیریں و دلآویز و رواں
وہ حُسن ہے کہیئے جِسے عظمت کا نشاں
گنجینۂ معنی ہے ادب اُردو کا
یہ غالبؔ و چکبستؔ و جگرؔ کی ہے زباں!

متفرّقات

①
روپڑ

ہمراز ہے کوئی، نہ ہے کوئی دمساز
سمجھے گا یہاں کون ہماری آواز
روپڑ[1] میں ہے اِس طرح ہماری ہستی
ویرانے میں بج رہا ہو جیسے کوئی ساز!

---

[1] ملازمت کے سلسلہ میں اس فقیر نے ۱۹۵۴ء سے ۱۹۵۹ء تک پانچ سال روپڑ میں گزارے۔ اُن دنوں روپڑ ضلع انبالہ کی ایک چھوٹی سی تحصیل تھی۔ روپڑ دریائے ستلج کے کنارے پر واقع ہے اور میری پہلی تصنیف "نسیمِ مغرب" ستلج کی لہروں کی دین ہے۔ (یہاں

(۲)

ہریانہ

بہتی ہیں جہاں دُودھ کی، گھی کی نہریں
اُٹھتی ہیں جہاں عیش و طرب کی لہریں
مٹّی بھی جہاں اُگل رہی ہے سونا
اُس خطّۂ شاداب میں جاکر ٹھہریں[۱]

(۳)

کثیر آبادی

مالتھس[۲] کا یہ ارشادِ گرامی ہے بجا
قُدرت ہمیں ہر جُرم کی دیتی ہے سزا
بڑھتی ہے جہاں بن کے وبا آبادی
ہوتے ہیں وہاں زلزلہ و قحط بپا!

۱؎ پنجاب کی از سرِ نو تنظیم کے دو سال بعد دسمبر ۱۹۶۸ء میں میرا ہریانہ میں مستقل طور پر تبادلہ ہوگیا اور ملازمت کے باقی سال یہیں گزاروں گا۔ (بہار)

۲؎ Malthusian Theory of population

(۴)

بینکوں کے قومیائے جانے پر[1]

دِل میں ہو اگر قوم کا غم اچّھا ہے
نادار پہ تھوڑا سا کرم اچّھا ہے
بینکوں کا قومیانا برحق ہے بہار
یہ سوئے مساوات قدم اچّھا ہے!

(۵)

سابقہ حکمرانوں کی خاص مُراعات[2]

واجب جو نہیں، ایسی روایت کیوں ہو
بس چند ہی لوگوں کی رعایت کیوں ہو
جب مُلک کے سب لوگ برابر ہیں بہار
شہزادوں پہ پھر خاص عنایت کیوں ہو!

Nationalization of Banks. [1]

Privy purses of Ex-rulers [2]

"نسیمِ مغرب" سے متعلق چند رائیں

جس طرح کتاب کا نام سُبک و لطیف ہے اِسی طرح اس کا مواد بھی ہے۔ اس میں انگریزی زبان کے نامور شُعراء کی شاہکار نظموں کے منظوم تراجم ہیں۔ ... پروفیسر امیر چند بہار کو ایک طرف اُردو شاعری پر عبور حاصل ہے تو دُوسری طرف وہ انگریزی زبان کے بھی ماہر ہیں۔ اسی لئے وہ انگریزی نظموں کے کیف و تاثّر کو اپنی ترجمہ شدہ اُردو نظموں میں کامیابی کے ساتھ سمو سکے ہیں تقریباً سب ہی نظمیں ایسی ہیں کہ اگر یہ نہ کہا جائے کہ وہ ترجمہ ہیں تو قطعاً طبعزاد معلوم ہوں۔ اِن میں شاعرانہ حُسن ہے۔ سادگی، لطافت اور دل نشینی ہے۔ اِن تمام نظموں میں فنّی التزام بھی ہے اور بھی تمام شاعرانہ آداب کا خیال رکھا گیا ہے۔

ماہنامہ "شاعر" بمبئی

پچھلے ساٹھ سال میں مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً انگریزی نظموں کے ترجمے پیش کئے گئے ہیں مگر زیرِ تبصرہ تراجم ایک ہی شاعر کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ شاعری کے ترجمے کی مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہ کوشش نہایت درجہ کامیاب کہی جاسکتی ہے اور فاضل مصنّف مُبارکباد کے مستحق ہیں۔ اُمید ہے وہ اپنی کوشش جاری رکھیں گے اور اُردو کو اپنے ترجموں سے مالا مال کرتے رہیں گے .... ترجمہ کے لئے جن نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے ان میں بیشتر بلند پایہ ہیں اور بعض کی اہمیت اس میں مضمر ہے کہ وہ نصابی کتابوں میں شامل ہیں۔ بحیثیت مجموعی انتخاب اچھا خاصا ہے۔

"کتابی دنیا" کراچی

ترجمہ کرنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن سچ پوچھیئے تو یہ فن نہایت دُشوار ہے۔ جب تک آدمی دونوں زبانوں کا ماہر بلکہ اداشناس نہ ہو اُس کا ترجمہ صحیح معنوں میں ترجمہ نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہماری زبان میں اچھے مصنّفوں کی تعداد کم نہیں ہے تاہم اچھے مترجم اُنگلیوں پر ہی گِنے جانے کے قابل ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ "نسیمِ مغرب" میں جو انگریزی کے ممتاز شعراء کی چند نظموں کے منظوم تراجم پر مشتمل ہے جناب امیر چند بہار نے نہ صرف اصل کے مفہوم کو بلکہ بڑی حد تک اس کی رُوح کو بھی برقرار رکھا ہے۔ موصوف کی عُمر کا زیادہ حصّہ انگریزی ادب کے درس و تدریس میں گُزرا ہے اور اُنہوں نے بڑی سنجیدگی اور ہوشمندی سے اِس وادی میں قدم رکھا ہے .... جناب مترجم کی جاں فشانی کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب ترجمے کے ساتھ اصل نظمیں بھی پیشِ نظر ہوں۔ ہم نے متعدّد نظموں کا مقابلہ کیا اور ہمیں یہ کہنے میں ہرگز تامّل نہیں کہ ترجمے اصل کی دیانتدارانہ ترجمانی اور زبان و بیان کی دلکشی اور رَوانی کے اعتبار سے بلند مقام رکھتے ہیں۔

ماہنامہ "سروج" دہلی

ترجمے کا کام تخلیق سے زیادہ نازک، مشکل، اہم اور ذمّہ دارانہ ہوتا ہے اور اس کے لیے تخلیق کے مقابلے میں کہیں زیادہ خونِ جگر کھانا پڑتا ہے۔ ان تراجم میں مفہوم انگریزی شاعر کا ہے اور اندازِ بیان بہار صاحب کا۔ زبان کی خوُبیوں پر بھی نظر ہے اور حُسنِ بندش پر بھی۔ اوّل تو بہار کی کامیاب ترجمانی، اُوپر سے زبان کا لُطف .... پروفیسر بہار کے شعروادب کا دائرہ چند فنّی پابندیوں کی قیود میں محدُود نہیں۔ اُن کی نظر کائناتِ شعر کے ہر پہلو پر ہے۔ وہ اپنی نظر کے لئے نیا اُفق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ماہنامہ "صبحِ نو"، پٹنہ

پروفیسر اے۔ سی بہار نے انگریزی ادب کی کچھ کلاسیکی نظموں کے جو منظوم ترجمے اردو میں کئے ہیں انکا ایک مجموعہ "نسیمِ مغرب" کے خوبصورت نام سے انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے جو ایشیا میں اُردو کتب کی اشاعت کا عظیم ترین ادارہ ہے کچھ عرصہ پہلے شائع کیا ہے۔ اس مجموعہ کی ادبی اہمیت اور افادیت کا اعتراف ہند و پاک کے اکثر بلند مرتبہ ادیبوں نے کیا ہے۔

اس خوش سلیقہ مترجم نے آفاقی ادب میں سے بھی بیشتر انہیں منظومات کو ترجمہ کے لئے چُنا ہے جن میں فلسفیانہ تفکّر اور غم کا عنصر غالب ہے۔ اس حُسنِ انتخاب کی الگ سے داد نہ دی جائے تو یہ مترجم کی حق تلفی ہو گی۔ اِن نظموں میں غم اپنے مختلف رُوپوں میں جلوہ گر ہے۔ ذاتی، انسانی اور کائناتی غم۔ سب طرح کے غم کی جھلک ان نظموں میں ملے گی۔ اِس پر بہار کے خونِ جگر کی آمیزش نے اِن نظموں کی تاثیر اور چٹخارے کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

"نسیمِ مغرب" میں ترجمہ کی زبان کو حتی الامکان سہل سلیس اور عام فہم رکھا گیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا گیا ہے۔ مترجم نے جن بحروں کا استعمال کیا ہے وہ زیادہ تر اصل نظم کے لب و لہجہ اور بحر سے متوازی ہیں۔ بیشتر انھوں نے خوشگوار، شگفتہ، رواں اور مترنم بحروں میں اپنے ترجموں کو ڈھالا ہے جس سے سوز و گداز، درد و اثر اور فلسفیانہ تفکّر کی گہرائی اور گیرائی میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

"نسیمِ مغرب" کا عوام و خواص میں خوب خیر مقدم ہوا ہے اور انکی اس گرانقدر ادبی کاوش کو قبولِ عام کی سند عطا ہوئی ہے حکومت پنجاب نے بھی اِسے قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا ہے اور اس پر پانچسو روپے کا انعام عطا فرمایا ہے ..... بطورِ شاعر اور بالخصوص بطورِ مترجم پروفیسر بہار کا مستقبل تابناک ہے، اور اُن جیسے محنتی، خوش بیان اور طبّاع ادیبوں کے ہاتھوں اُردو کا مستقبل محفوظ اور تابناک تر

اقتباس از "ماہِ نو"

"نسیمِ مغرب" انگریزی کی چھبیس ۲۶ شہرۂ آفاق نظموں کا منظوم ترجمہ ہے
جو پروفیسر امیر چند بہار کی سعیٔ فکر کا نتیجہ ہے۔ ایک زبان سے دوسری
زبان میں ترجمہ کرنا اور پھر وہ بھی منظوم ترجمہ، ایک انتہائی مُشکل کام ہے۔
دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہونے کی صُورت میں بھی یہ کام جُوئے
شِیر لانے سے کم نہیں۔ ایک زبان کی نظم کو دُوسری زبان میں نظم کی
صُورت میں اِس انداز سے منتقل کرنا کہ نظم کی رُوح اُس میں شامل رہے اور
اس کے ساتھ ساتھ صحتِ زبان اور لطیف احساسات و جذبات کی
شگفتگی بھی قائم رہے، ایک بہت بڑا فن ہے جسے بہارؔ صاحب نے
نہایت خُوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا ہے .... اس میں ذرا بھی
مبالغہ نہیں کہ "نسیمِ مغرب" ہمارے شعری ادب میں گراں قدر اضافہ ہے
اور یہ نظمیں ہمارے لئے ایک ادبی سرمایہ بن گئی ہیں ....

"نسیمِ مغرب" کو انجمن ترقی اُردو ہند علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔
ضخامت ۱۲۰ صفحات اور مجموعہ کی قیمت دو روپے پچاس پیسے ہے۔

ریڈیو کشمیر
جموّں